

الحکماء

بند پایہ علمی تحقیق کا ایک بے نظیر مَرَح
جو ادبی لطافتوں اور ٹھوس علمی معلومات سے لبریز ہے

ابوالکلام آزاد

﴿اصحابِ کہف﴾

مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد

معاون خصوصی: مفتی محمد امجد حسین صاحب

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

41 - EAST AVE
E 12 (6SG)
LONDON → U.K

PH . 0044 / 2084705016

مورخ زینوفون یونانی لقوام
کاشاگرد مقام ۲۸

خار من کی قبل اسلام تاریخ
تین میا کی ادوار ۴۴

سائنس کو سلفیت
کی وسعت ۴۶

سائنس ذوالقرنین کیخسرو
کا ایک پست کو تین نام دیا
کیخسرو بن ذوالقرنین
کابینہ کیقباد کیقباد کابینہ
دارا پورشاہ کیقباد کابینہ
مستند کانی دارا کابینہ
اردشیر مدحہ کابینہ
لیکن ۹۰ دارا کو سائنس
کا شمار زاد کابینہ

اصحابِ کہف

از

مولانا ابوالکلام آزاد

شعبہ کتب

شعبہ ادب لاہور
ادبستان لاہور

بار دوم

قیمت دو روپے

(محررفیق ملک نے اردو پریس لاہور میں طبع کرا کر ادبستان لاہور سے شائع کی)

واقعات اصحابِ کہف و ذوالقرنین

اصحابِ کہف

۷

ذوالقرنین

۳۳

نشرة عامة في نبي الله صلى الله عليه وآله

أصحاب الكهف والزقري

کے لوگ ہیں۔

یہ گویا اس تمام معاملے کا حاصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت ۱۳ میں فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّفِیْسُ عَلَیْكَ نَبَأُہُمْ بِالْحَقِّ ۖ

(الف)

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشتی کر لینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ اُن کی قوم چاہتی تھی، انھیں سنگ سار کر دے۔ یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے۔ انھوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

(ب)

جب وہ غار میں اُٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کے لئے بھیجا اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو لیکن حکمت الہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی اور یہ معاملہ لوگوں کے لئے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انھوں نے غار میں پناہ لی تھی، وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرتد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔

خلاصہ

سورہ کہف آیت ۹ سے اصحاب کہف کی سرگزشت شروع ہوئی۔ فرمایا:-

یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اُس میں پوشیدہ رہے۔ آبادی سے ان کا کوئی علاقہ نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ پھر وہ اُٹھائے گئے۔ یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ واضح ہو جائے دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔ دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کہف اور ان کی قوم و ملک

(۵)

اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں سات تھے مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہئے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

تفسیر

قرآن نے کہف کے ساتھ "الرقیم" کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

الترسیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر "پیٹرا" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور عرب اسے "بطرا" کہنے لگے۔ عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک پیٹرا بھی ہے۔ اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل

اصحاب کہف

مسیحی مذہب کے ابتدائی قرون میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و جبر سے عاجز آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے۔ اور ایک عرصہ کے بعد ان کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گزرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے، ایک انس میں بیان کیا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا؟

کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ ۶۶۴ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا۔ یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کڑیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اعقاب کعبہ کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن

نے صاف صاف اُس کا نام "الرقیم" بتلا دیا ہے۔ اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ راقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے "کتبہ" پر محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دور کی باتیں ان کے علم میں آئی ہوں۔ پس ضروری ہے کہ یہ قرب و جوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جاسکے جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلہ پر۔ ثانیاً بنطیوں کی وہاں آبادی تھی اور بنطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے یقیناً بنطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوگی اور انہی سے عربوں نے سنا ہوگا۔

خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔ اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مار سورا تک تعمیر کر دی تھی لہ پھر اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی اس لئے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں۔

اصل واقعہ

(۱) آیت (۹) "ام حسب ان اصحاب الکہف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا" کا اسلوب خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ اصحاب الکہف والرقیم کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کا

لہ جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے وہاں پہلے ترسیں آباد تھا جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

معاملہ قدرت الہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحی الہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کر رہی ہے۔ چنانچہ پہلے مجملہ اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلادیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے پھر آیت (۱۳) میں فرمایا "نحن نقص عليك نبأهم بالحق" اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنا دیتے ہیں، یعنی واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے۔ تمام سرگزشت کا حاصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہئیں۔ فرمایا:-

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک فار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اُن کے پیچھے ظلم و ستم کی قوتیں تھیں، سامنے نار کی تاریکی، وحشت، تباہی وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا: "خدا یا! تری ہی رحمت کا آسرا ہے اور تری ہی چارہ سازی کا بھروسہ" چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اُٹھا کھڑا کیا، تاکہ واضح ہو جائے، ان دونوں جماعتوں میں سے کون

گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائجِ عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے ؟
یعنی صورتِ حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک اصحابِ کھف
تھے۔ ایک اُن کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی دوسرے نے
ظلم و تشدد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر
گزری تھی۔ اُس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اُس پر
بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر انھیں مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ
دونوں میں سے کس نے کیا ہے ؟ اور کس نے کھویا ہے ؟ کون ان دونوں
میں وقت کا بہتر اندازہ شناس تھا ؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے
کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عسمر بہت تھوڑی تھی اور بالآخر وہی راہ
فتح مند ہونے والی تھی جو اصحابِ کھف نے اختیار کی تھی۔ کیوں کہ
بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی اور جب کچھ عرصہ کے بعد
وہ فارسے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تو اب مسیحی ہونا کوئی
ناقابلِ معافی جرم نہیں تھا۔ عزت و سربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔
صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی
تھی جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباعِ
حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلابِ ظہور میں نہیں آتا۔
(ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی ہیں
جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے ان کی مخالفت میں تمام

باشندے کمر بستہ ہو جاتے اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے
تو سنگ سار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی
سے منہ موڑیں اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکرِ الہی میں مشغول
ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں مقیم ہو گئے۔

غار کی نوعیت

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ غار میں چلا
گیا۔ جس غار میں انھوں نے پناہ لی، وہ اس طرح کی واقع ہوئی
ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا، لیکن سورج
کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ تو چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے
دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر
جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب
ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال و جنوب رویہ واقع
ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔ روشنی او
ہوادونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے
بھی راہ نہیں پاسکتی۔

اس صورتِ حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔
ایک یہ کہ زندہ رہنے کے لئے وہ نہایت محفوظ اور موزوں
مقام ہے۔ کیونکہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے مگر دھوپ کی

پیش نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے۔ جگہ کی کمی نہیں۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لئے اندر کا منظر بہت ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لئے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں، اس لئے بالکل اُجلا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے کی ملی جلی حالت رہتی ہے اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ضرور ایک بھیانک منظر پیش کریگی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے۔ اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھے تھے باشندوں کا یہی حال ہو گا جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کھف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ ان کے غار نے زیارت گاہ عام کی حیثیت اختیار کر لی اور امراء شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

(رج) اصحاب کھف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ "فضر بنا علیٰ"

آذانہم فی الکھف سنین عدا (۱۱) "ضرب علی الآذان" کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے۔ یعنی دنیا کی کوئی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے۔ یعنی ان پر نیند طاری ہو گئی تھی اور چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا۔ اس لئے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لئے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں لیکن وہ کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نفی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ التبیہ۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب کھف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوئے رہے۔ اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اسی طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں عرب میں قصہ کے اصلی راوی شام کے بنی تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر منتہی ہوتی ہیں جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں مثلاً صفاک اور سدی۔ بہر حال اگر یہاں ضرب علی الآذان سے مقصود نیند کی حالت ہو، تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ثم بعثنا ہم کا مطلب

یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے۔ طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

(د) آیت ۱۸۔ ”وَحَسَبْنَاهُم يَغْفُلُونَ“۔ میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اسی میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کئے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں نہ کتا ہی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟

اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا۔ اگر تو وہ سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا وہ اس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہوشیار و بیدار کیوں سمجھے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا قلبہم ذات الیمین وذات الشمال کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی چونکہ داہنے بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے یہ بیدار ہیں لیکن یہ توجیہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلتا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہونگے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے۔ لطف یہ ہے کہ قلبہم ذات الیمین وذات الشمال کی تفسیر میں یہی مفسر ہیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ

بدلتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ۔ بعض کہتے ہیں تین سال بعد، بعض کہتے ہیں نو سال بعد!

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے اس پرانے نکتہ سنجوں نے غور نہیں کیا۔ ”وَأُطْلِعَتْ عَلَيْهِمُ لَوْلِيَّتُ مَنَّهُمْ فِرَارًا وَلَمَلَّتْ مَنَّهُمْ رِعْبًا“ یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھاگ کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو، اور اٹنے پاؤں جھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا، غار کے اندر اصحاب کھف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بے حد دہشت انگیز ہے۔ اگر کوئی آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے۔ مثلاً اٹنے پاؤں جھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے۔ علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ اتنا باریک بین نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اول نظر دیکھ لے اور وہ بھی اس حالت میں کہ داہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہوں۔

در اصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخمیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے۔ اہلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ کس وقت کی ہے؟ اُس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جا کر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی جب انکشافِ حال کے بعد دوبارہ مستکف ہو گئے؟ مفسرین نے خیال کیا، اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے۔ اور یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے۔ یعنی جب وہ ہمیشہ کے لئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہو گئی تھی۔ ”تَحْسِبُهُمْ يَقَافًا وَهُمْ رُقُودٌ“ میں ”یقاف“ سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے اور ”رُقُود“ سے مراد ہونا۔ نہ کہ بیداری اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی و موت کے لئے یہ تعبیر عام و معلوم ہے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہئے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنہیں پیش آیا تھا وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرون ہی میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی، جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترکِ ملائق کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ

میں مشغف ہو جاتے تھے۔ اور پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع و نشست کی جو حالت اختیار کر لیتے اسی میں پڑے رہتے یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی۔ کیونکہ عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لئے یہی وضع رائج ہو گئی تھی۔ لہ

لہ عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی۔ کیونکہ یہودیوں کے اوضاع نماز میں اس وضع کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہر نماز میں کیا کرتے ہیں۔

دنیا کی مختلف قوموں نے ہندو کی دنیا زندی کے اظہار کے لئے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے اور بادشاہ کے قدموں یا دامگج بوسہ دیتے۔ مجربوں کے لئے بھی ضروری تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ گھٹنے ٹیک کر سنیں۔ مصر، بابل اور ایران میں سجدہ کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے منہ ہو کر بالکل لیٹ جانے کی۔

غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پروا ہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے۔ نہیں ہوتی تو یہ جستجو نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان کے یوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ بگاہ نظر آ جاتی ہے۔

جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرأت نہ کرتا۔ مدتوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے تھے۔ اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلہ سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ میکیان کے تہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے اور اپنی اصل وضع و ہیئت پر باقی تھے۔

ابتداء میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے کھنڈر اختیار کئے گئے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمد و رفت

کے لئے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جو جاتا تھا وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاح دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعہ لوگ غذا بھی پہنچا دیتے۔

بعد کو جب مناسک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہو گئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمہ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کو عام طور پر 'Logette' کہتے تھے۔ اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر یہ لاطینی لفظ کندہ کر دیا جاتا کہ Tu-ora یعنی اس کے لئے دعا کرو۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی، اور اس کا بڑا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی اور سینٹ بینی ڈکٹ (Benedict) نے سب سے پہلے اس کے قواعد و ضوابط مضبوط کئے۔ سینٹ بینی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا اضطرابی حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اُس نے

ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی۔ یعنی ابتدا میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یہ اضطرابی طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کھف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتدا میں قوم کے ظلم نے انھیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار کر لی تھی وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لئے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اس کے مالک مر گئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اُسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے، کوئی سجدے میں پڑا ہے، کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے۔ وہ بھی بازو

پھیلانے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ مینظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے۔ کیونکہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

(منہ) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو، ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لئے صرف ایک کبھی کا انتظار تھا۔ تحسبہم ایقافاً و ہم رتود کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ نہیں۔ تو اطلعت علیہم لولیت منهم فراراً و الملت منهم رعباً کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور متہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ یقیناً مارے دہشت کے چیخ اٹھو گے۔ اسی طرح ”و قبلہم ذات الیمین وذات الشمال“ کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ فار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے جیسا کہ آیت ”وتری الشمس اذا طلعت“ سے قیاد ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی اور ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود دل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتی جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۷۱ میں ہے اور کیوں اسے قدرت الہی کی ایک نشانی فرمایا کہ ذالک من آیات اللہ؟ معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل اُس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت ۸ میں بیان کی گئی ہے کہ تحسبہم ایقافاً و ہم رتود۔ یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں تھیں کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس لئے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں متکلف ہوئے تھے وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزرنہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سٹرا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی تھی۔ روشنی پہنچتی رہتی مگر تپش سے پوری حفاظت تھی۔ و ذالک من آیات اللہ (رح) و لبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین و ازدادوا تسعاً (۲۵) کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ قل اللہ اعلم باللبثوا؟ مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے کلفات کرنے پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے اُن کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کئے تھے، اسی طرح یہاں مدت بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں، غار میں

تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نو سو برس اور بڑھا دیئے۔ تم کہہ دو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے لوگوں کا قول ہے۔ اور سیدوں سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اسی سلسلہ کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔

(ط) امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ”اولاً تک قوم فنا وعدہ و امتداد طویلہ یعنی اصحاب کھف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ اُن کے اجسام فنا ہو گئے جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گزرا اصحاب کھف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ کیسی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو اشارات کئے گئے ہیں اُن کی تفصیلات کے لئے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

The Paradise or Garden of the Holy Fathers
by E. A. W. Budge.

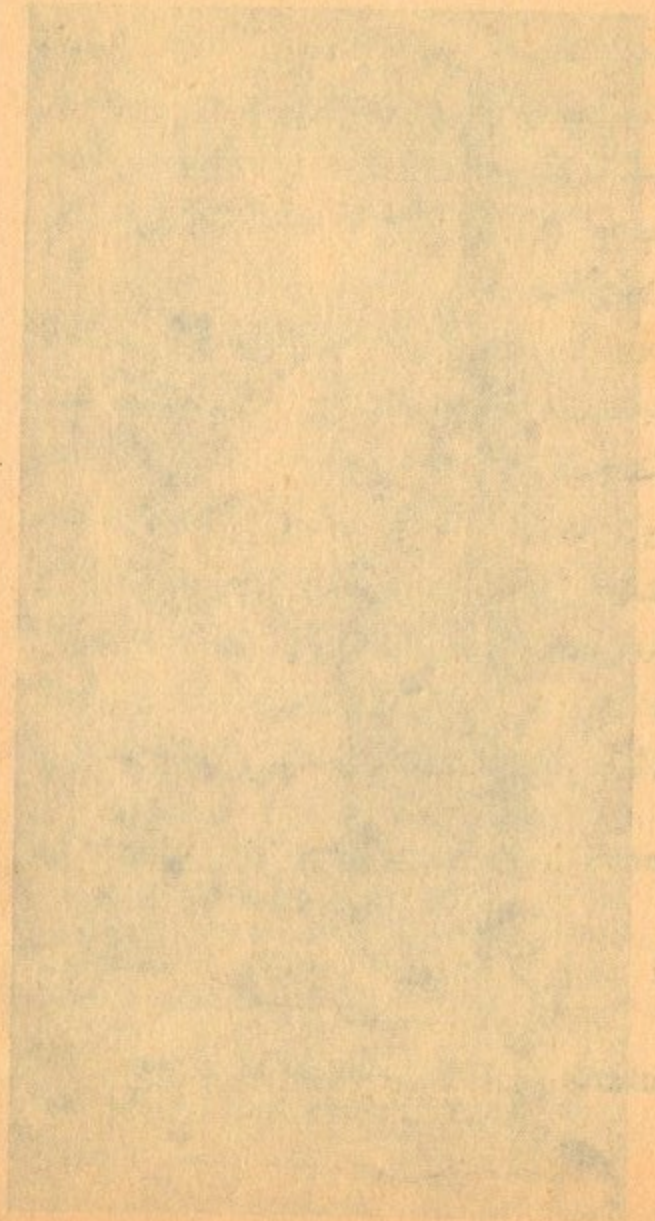
The Evolution of The Monastiol deal by H.
Workman.

Five Centuries of Religion. by G. G. Coulton.
The Medieval Mind, by H. O. Taylor.



تین سو برس کا عرصہ و مدت کا بیان

دُوالقرنین



سورہ کہتے ہیں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے وہ ذوالقرنین کا ہے
 کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ
 سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہوا
 کیونکہ صودت کی ہے۔

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر یہ حیثیت
 مجرمی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین
 کے نام سے مشہور تھا۔ یعنی ذوالقرنین کا لقب خود تیرا نے تجویز
 نہیں کیا ہے۔ پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا "ولیس لکونک
 عن ذی القرنین"۔

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور
 ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لئے ہو سکتا تھا اس کے لئے فراہم

ہو گیا تھا۔

ثالث اس کی بڑی جہیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کئے۔ پھر مشرقی۔ پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درہ تھا اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچا کرتے تھے۔
 رابع اس نے وہاں ایک محکمہ تعمیر کردی اور یاجوج و ماجوج کی راہ بند ہو گئی۔

خامشادہ ایک عادل حکمران تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم ملی، جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہئے جو جرم و بد عملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادسا وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حرصی نہ تھا جب ایک قوم نے کہا، یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں۔ ہم خراج دیں گے۔ تو اس نے کہا "امکنی فیہ ربی خیر"۔ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی

طرح سے یہ کام نہیں کر دل گا۔ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی سینک کے ہیں۔ پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینکوں والا۔ لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو۔ اس لئے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تحلفات کرنے پڑے پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لئے متاخرین کی نظر میں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور اگرچہ حسب عادت وہ تمام اعتراضات نقل کر دیئے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں لیکن پھر حسب عادت ان کے بے محل جوابات پر مطمئن بھی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا۔ نہ عادل تھا۔ نہ مفتوح قوموں کے لئے فیاض تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی۔

بہر حال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے۔



دانیال نبی کا خواب

اگر ذوالقرنین کے منہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف ایک دور کا اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب جو انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لئے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت بامال ہو چکی تھی۔ اُن کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا۔ اُن کے شہر اُجاڑتے۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہان بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہیں کی نسبت تو رات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "میلش فار" شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اس خواب میں انہیں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔

چنانچہ کتاب دانیال میں ہے۔

"میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ بچم اترے اور دھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا۔ اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ رہا تھا کہ دیکھا بچم کی طرف سے ایک بکرا آکے تمام روئے زمین پر پھیر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا، اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے؛

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی پادشاہت ہے اور بال والا بکرا یونان کی۔ جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (مینڈھا) اور فارس کی ملکوت کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور چونکہ یہ دونوں ملک تیسری کرا ایک شہنشاہی بننے والی تھیں، اس لئے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں

والے میٹھے کھانسی میں ظاہر کیا گیا۔ پھر اس میٹھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا۔ یعنی سکندر مقدونی تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیا فی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لئے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی خوشحالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا۔ یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے نفع مند ہونے والا تھا اور پھر اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی۔ چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا اس نے میڈیا اور پارسی کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم شان شہنشاہی قائم کر دی اور پھر بابل پر پے درپے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجیب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تصور پیدا ہو گیا ہو۔ یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا۔ اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان

فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے ترک و تخمین کے تمام پردے اٹھا دیئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اتھنز (Pasargadae) کے کنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر بکھے ہوئے ہیں اور سر پر میٹھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اوپر خط منحنی میں جو کتبہ کندہ تھا، اس کا ترجمہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے۔ مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا۔ اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوئی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔ دو سینگوں کا تخیل ابتداء میں کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطور خود سائرس نے یا باشندگان پارسی نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر آرمازرکسیر (ارتخشست) تک

۱۰۰ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اول تک، تمام شہنشاہان پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے "ذوالقرنین" کا لقب

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) یاد رکھنا چاہئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غالباً گوریو گوروش تھا، جبکہ دارا کے کتبہ بابلے ستون سے معلوم ہوتا ہے لیکن یونانی اسے سائرس Cyrus کہتے لگے۔ اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ ایسا ارمیا اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے۔ اور یہی گوروش ہے جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب مورخ اسے کیمسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

سائرس کا لڑکا کیمس بن سینر Cambyes ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کبوجہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر کعبادہ کی شکل اختیار کر لی۔ شاہنامہ نے بھی اسی کو اختیار کیا کیونکہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کعبادہ کے بعد دارا یووش ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد آرتازر کبیز ہے۔ اسے تورات میں آرششت کے نام سے یاد کیا ہے اور عربوں میں اردشیر مشہور ہو گیا۔

پیدا ہو گیا ہو۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو ہو تصویر ہے اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم و گمان بھی کیا جاسکے۔

زمانہ حال کے تحقیق تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد حملہ اسکندر سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پارٹھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسرا ساسانی سلاطین کا۔ فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو حملہ اسکندر سے پہلے گزرا اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے براہ راست ذرائع مفقود ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں، تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ متمدن مورخ ہیں ہیروڈوٹس (Herodotus) ٹیسیاز (Ctesias) اور زینوفن (Xenophon)

فتح ایران کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنی چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی

روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں حملہ اسکندر سے پہلے کا زمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے جس طرح ہندوستان میں پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور رامائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روایتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں۔ جب دقیقہ اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انھیں عربی میں یہی مواد ملا اور اسی کو انھوں نے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ پس یہ تمام ذخیرہ قبل از اسکندر عہد کے لئے کچھ سودمند نہیں ہے اور سائرس کے حالات کے لئے ہیں تمام تریونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو ملکوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمال مغربی میڈیا۔ چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں اس لئے قدرتی طور پر یہ ان سے جڑی ہوئی تھیں۔ دونوں ملکوں میں مختلف قبائل کے امراء تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔

۶۱۲ قبل مسیح میں جب نینوا تباہ ہو گیا اور آشوری فرماں روائی

لے دارا کے کتبے بے ستون میں اس کا نام یاد آیا ہے۔ اس لئے میڈیا یونانی تلفظ سمجھنا چاہئے۔ عرب مورخوں نے اسے مہات سے تعبیر کیا ہے۔

ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تو میڈیا کے باشندے آزاد ہو گئے اور تبدیلیج ایک قومی حکومت نشوونما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سر اٹھانے کا موقع ملا اور حکمران خاندان پیدا ہو گیا۔ تاہم یہ دونوں ملکیتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت نصر کی مہارانه فتحندیوں نے تمام ایشیا میں سر بلند کر دیا تھا، سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرماں روا ہو گیا اور اس طرح
دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت
اختیار کر لی۔

پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم
و قہر کی خونریزیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و
صالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی داد رسی
اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ برس کی مدت بھی پوری
نہیں ہوئی تھی کہ بھر اسود سے لے کر بکٹریا و بلخ تک ایشیا کی تمام
عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سر بسجود ہو چکی تھیں۔

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سارس کے ابتدائی حالات
نے بھی ایک پراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کر لی ہے اور ہمیں اس کی جھلک
شاہنامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آ جاتی ہے۔ اس کا اٹھان
زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا بلکہ ایسے عجیب حالات میں
جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک
غیر معمولی کرشمہ سمجھی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو اس کے نانا
اسٹیاجس (Astyages) نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا۔
لیکن وہ ایک حیرت انگیز طریقے پر بچا لیا جاتا ہے۔ اور اس کی ابتدائی
زندگی جنگوں اور پہاڑوں میں بسر ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ
اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل اسے ملک میں نمایاں کرتے

سائرس کا ظہور

لیکن ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت، غیر معمولی حالات
کے اندر ابھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔
یہ پارس کے ایک ہی نیرنگہ خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا جسے
یونانیوں نے سائرس، عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کھسرو کے نام
سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔

لے دارانے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلہ نسب ہخامنش نامی بادشاہ
سے ملایا ہے۔ یہی ہخامنش یونانی میں (Achaemenes) ہو گیا۔
ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پڑدادا تھا۔ یعنی ایک
می نیز سے میز پیز (چائش پش) پیدا ہوا۔ اس سے کم بی میز (کبوجہ) یا
کیقباد اول اور کم بی میز سے سائرس۔ سائرس نے اپنے بڑے (بڑے)
کا نام بھی کم بی میز رکھا تھا۔

ہیں۔ اور اس کی خاندانی شخصیت پہچان لی جاتی ہے۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے، لیکن اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا خیال نہیں گزرتا۔ جتنی کہ خود ایشیا گس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (Lydia) کے پادشاہ کروسیس (Croesus) سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کروسیس کی طرف سے ہوا تھا اور اُس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیا کے کوچک کا مغربی و شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی۔ جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا لیکن رعایا کے ساتھ کسی طرح کی بد سلوکی نہیں کی گئی۔ انھیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب جنگ کی حالت سے گزر رہا ہے۔ البتہ کروسیس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے غم و ہمت کی آزمائش کے لئے سائرس نے حکم دیا تھا، چتا سار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ و چتا پر بیٹھ گیا ہے تو فوراً اس کی جان بخشی کر دی اور اس نے بقیہ زندگی عزت و احترام کے ساتھ بسر کی۔

اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ گیلدر میا (مکران) اور بلخ (بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔ یہ مہم ۵۴۴ اور

۵۴۵ قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہوگی۔ تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی ہے کہ بیل شازار (Belshazzar) لہ کے منالہ سے انھیں نجات دلائے۔

نینوا کی تباہی نے ایک نئی بابل شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں اور بنو کد رزار (نحشت نصر) کی قیادت میں فتوحات نے تمام مغربی ایشیا کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ وہ صرف پاؤشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو

لہ دانیال بنی کی کتاب میں اسے جابجا "بیش فار" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ لیکن بابل نے کتبوں سے اس کا صحیح نام جو معلوم ہوا ہے یہی ہے۔ علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ نوشتہ کے لکھنے والوں نے سائرس اور دارا کے دو مختلف حلوں کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا ہے اور کہیں سائرس کی جگہ دارا کا نام آ گیا ہے کہیں دارا کی جگہ سائرس کا۔ تاریخی حیثیت سے جو واقعہ ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بابل پر فارس کے دو حملے ہوئے ہیں۔ پہلا سائرس نے کیا دوسرا دارا نے۔ سائرس نے بابل فتح کر کے اس کی اندرونی حکومت و طنی اُمرائے ہاتھ چھوڑ دی تھی۔ پھر تقریباً بیس برس بعد امراء بابل نے بغاوت کی اور دارا مجبور ہوا کہ دوبارہ بابل کو فتح کرے۔

غلام بناتا اور ملکوں کو تباہ کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جویانہ قوتوں کی جانشین ہوتی اس کے بعد بابل کے مندروں کے پجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونی دس

Nabonidus کو تخت نشین کیا تھا۔ لیکن اس نے حکومت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا۔ اسی کی نسبت دانیال نبی کے صیغہ میں ہم پڑتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی اور ایک غیبی ہاتھ نے نمایاں ہو کر "منے منے تعقل اور فرسین" کے الفاظ دیوار پر لکھ دیئے تھے۔

(دانیال ۵: ۱)

تمام مورخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور ناقابل فتح کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی، تہ درتہ اور اونچی تھی کہ اسے محاصرہ کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بابل کے سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور دو آہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چونکہ خود باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آگئے تھے اور سائرس کے لئے چشم براه تھے اس لئے انھوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔ خود با بلی حکومت کا ایک سابق گورنر گوب ریاس Gobryas اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیرودوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص سے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا

اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے شہر فتح ہو چکا تھا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح نبی اسرائیل کے لئے زندگی و خوش حالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے ساٹھ برس پہلے وحی الہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی، یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی۔ نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یروشلم میں اس کے لئے ایک ہیکل بناؤں (یعنی قدیم برباد شدہ ہیکل سلیمان کو از سر نو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کا ساز و سامان اس کے لئے مہیا کرنا چاہئے" اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بنو کد زرار ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا، بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بفر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیئے جائیں۔

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیا میں مسلم ہو گئی ۵۳۹ ق م میں صرف اسی کی نہایت شخصیت عظمت و حکمرانی کے عالمگیر تحت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گنہگار تھا۔ لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہا فرمانروا ہے جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندوں کا مرکز رہ چکی ہیں۔ فتح بابل کے بعد

وہ تقریباً دس برس تک زندہ رہا اور ۵۳۹ قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔
اب قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے اس
بات پر غور کر لینا چاہئے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت
کے بارے میں کیا تھیں، اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف
بجھ رہے تھے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے، جن کا ظہور
سائرس کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔ انھوں نے
پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے کہ بابل کے مائتوں ظہور میں آئیگی
اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلے میں خورس
(سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

”خداوند تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ یروشلم
پھر آباد کیا جائے گا۔ یہودا کے شہر بنائے جائیں گے۔ میں اُس کے
ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا میں خورس کے حق میں کہتا
ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔
..... خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ
میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا تاکہ قوموں کو اس کے قابو میں
کر دوں اور پادشاہوں کی کمریں کھلوادوں اور دہرے دروازے
اس کے لئے کھول دوں۔ ہاں میں تیرے آگے چلوں گا۔ میں تیری جگہوں کو سیدھا
کروں گا۔ میں متیل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ میں گڑھے بنائے

مشرق میں بائبل کے مروجہ اور سرزد الوتھن کی تصویر



اس نقشہ میں تہ کے نشانوں کے ذریعہ بائبل کی روایت اور ان کے خلاف
مشرق و مغرب کے مروجہ اور سرزد الوتھن کی تصویر
مشرق و مغرب کے مروجہ اور سرزد الوتھن کی تصویر
مشرق و مغرب کے مروجہ اور سرزد الوتھن کی تصویر

خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے گنج تھے عطا کروں گا۔ اور
یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ میں خداوند اسرائیل
کا خدا ہوں جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لئے تجھے تیرا
نام صاف صاف لے کے بلایا ہے۔ (یسعیاہ ۴۱: ۲۴)۔

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا
چرواہا ہوگا۔ اور میں نے اسے اس لئے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابل میں
کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اُسے "خدا کا سرخ" بھی کہا ہے۔
اسی طرح یرمیاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"قوموں کے درمیان منادی کر دو اور اسے مست چھپاؤ۔ تم کہو،
بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا۔ مرد و یک سرایمہ کیا گیا۔ اس
کے بت خجل ہوئے۔ اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ
اُمتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے جو اُس کی
سرزمین اجاڑ دے گی۔ یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں
رہے گا۔ (۱: ۵۰)۔

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ستر برس تک
یہودی بابل میں قید رہیں گے اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر
ہوگی۔

"خداوند کہتا ہے: جب بابل پر ستر برس گزر چکیں گے تو میں
تمہاری خیرسر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکارو گے اور میں

جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور مجھے پا لو گے۔ میں تمہاری اسیری ختم کر دوں گا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا۔ (۱۰: ۲۹)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہو گا جو بنی اسرائیل پر پھر لوٹ آئے گی۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا، تو دانیال نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہو گئے تھے) اسے یسعیاہ بنی کی پیشین گوئی دکھائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے تعمیر بیکل کے لئے جاری کیا۔

زمانہ حال کے نقاد ان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھادی گئی ہوں۔ خصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح طور پر سائرس کا نام موجود ہے۔ لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا جن کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے۔ علاوہ بریں تورات کے آخری صحیفہ

جو فتح بیت المقدس کے آثار میں یا اسیری بابل کے زمانے میں لکھے گئے ہیں تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کر لئے گئے ہیں کیونکہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں متداول رہے، اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ ان کے نسخے نابود ہو گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یسعیاہ بنی کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی کے خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا ہو۔ صرف قوم و ملک کا ذکر ہوا اور بعد کو یہ نام بڑھادیا گیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد برابر یہی رہا کہ سائرس کا ظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوا تھا، اور وہ خدا کی ایک پسندیدہ ہستی تھی جو اسی لئے پیدا کی گئی تھی کہ مطلوبوں کی داد رسی ہو اور بابلوں کے ظلم و شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

قرآن کی تصریحات اور سائرس

اب غور کرو۔ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے، وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس بحث کے آغاز میں تصریحات قرآنی کا خلاصہ دے دیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہیں۔ ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

(۱) سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی پادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی۔ نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال بنی کے خواب کا ظہور، رحمت الہی کی واپسی کی بشارت۔ بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ! پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو؟

سہی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے، اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے: قال، قالت الیہود: خبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التورات الا فی مکان واحد۔ قال: ومن؟ قالوا: ذوالقرنین۔ یعنی یہودیوں نے آنحضرت سے کہا:۔ اس نبی کی نسبت ہمیں مبرا دیجئے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے: آپ نے فرمایا۔ وہ کون؟ کہا، ذوالقرنین۔ چونکہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال بنی کے خواب ہی میں آیا ہے۔ اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکار کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تلج رکھا گیا تھا، اور یہ فارس اور مادہ کی مملکتوں کے اجتماع و اتحاد کی علامت تھی۔

(۲) اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ۔ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے، یہ ہے کہ "انا کنا لہ فی الارض، و آتیناہ من کل فئئ سیا" (۸۴)۔ ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ قرآن جب کبھی انسا کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے، تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف معض اس کے فضل و کرم سے ظہور

میں آئی ہو۔ مثلاً حضرت یوسف کی نسبت فرمایا۔ "کذا الک مکنا یوسف فی الارض" ۵۴: ۱۲ اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کو حکومت دے دی۔ ہم نے دے دی کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضل الہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو۔ پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انھیں محض توفیق الہی کی کوشش سے سمجھا جاسکے کیونکہ اس کے ممکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی ہے۔ قبل اس کے کہ پیدا ہو، خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہشمند ہو گیا تھا۔ ایک دفادار آدمی اس کی زندگی بچاتا ہے، اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گڈریئے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لئے خالی ہو جاتا ہے! یقیناً یہ صورت حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔ نوادر ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے، اور صاف نظر

آ رہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے، اور زمانہ کی عام رفتار تقیم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

(۳) اس کے بعد اس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف۔ ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف۔ تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یا جورج اور یا جورج وہاں آکر لوٹ مار چایا کرتے تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

مغربی مہم

اد پر پڑھ آئے ہو کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے پادشاہ کرڈس نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کوچک کی یہ پادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور

۱۰ یاد رہے کہ پچھم اور پورب کے لئے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں بھی جا بجا آئی ہے۔ مثلاً ذکر یاسی کی کتاب میں ہے۔ "رب الافواج فرماتا ہے: میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک او اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑالوں گا" (۷: ۸)

ہوئی پہلی صدی کے اندر ابھری تھی۔ اس کا دارالحکومت سارڈیس Sardis تھا۔ سارڈس کی تخت نشینی سے پہلے میڈیا اور میڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بالآخر کروئس کے باپ نے سارڈس کے نانا ایشاگس کے باپ سے صلح کر لی، اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لئے باہمی ازدواج کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروئس نے یہ تمام عہد و پیمان اور باہمی ملائق بھلا دیئے۔ وہ سارڈس کی یہ کامرانی برداشت نہ کر سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اس نے پہلے بابل، مصر اور اسپارٹا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پیریا Pteris پر قبضہ کر لیا۔

اب سارڈس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے۔ وہ میڈیا کے دارالحکومت ہگمتانہ سے جواب جہان کے نام سے پکارا جاتا ہے نکلا، اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پیٹریا اور سارڈس کے قریب واقع ہوئی تھیں ایسڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا۔

ہیروڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ

لے دارا کے کتبوں میں اس کا نام ہی آیا ہے مگر ہیروڈوٹس وغیرہ یونانی مورخین نے اسے اکبتانا (Acbatena) لکھا ہے اور یہی نام یورپ میں مشہور ہو گیا تھا۔

بیان کی ہے، اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں۔ لیکن یہ موقع اطناب کا نہیں۔ وہ کہتا ہے سارڈس کی فتح مندی ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پیٹریا کے معرکہ کے بعد صرف چودہ دن کے اندر ایڈیا کا متحدہ دارالحکومت مسخر ہو گیا، اور کروئس ایک جنگی قیدی کی حیثیت میں سارڈس کے آگے سرنگوں کھڑا تھا۔

اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اس کے زیر نگین تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اسی طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال بعد طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے ختمند قدموں کے لئے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں روک نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے لے کر میڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا، اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔

یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی، صریح مغرب کی لشکر کشی تھی کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو۔ تم دیکھو گے کہ

تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمنرا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی سی شکل دے دی ہے۔ لیڈ یا کارا احکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل موجودہ سمنرا سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ پس جب سارڈیس کی تخریب کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہوگا، جو سمنرا کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمنرا نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کچھڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے، او شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ ”و جب ہا تعرب فی عین حمتہ“ (۸۶) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدے کے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں، لیکن ہم سمنرا کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں، تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تعالیٰ آہستہ آہستہ سمنرا میں ڈوب رہی ہے۔

مشرقی ہمس

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیرودوٹس اور ٹی سیاز دونوں اس کی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو لیڈ یا کی فتح (عاشیہ ص ۶۲)

کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی، اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ ”مشرق کے بعض وحشی اور صحرائین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی“ یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق ہے کہ ”تحتیٰ اذ بلغ مطلع الشمس“ و جب ہا تطلع علی قوم لم تجعل لهم من دونہما ستر (۹۰) جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔ یعنی خانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مورخین کی صراحت کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ بکٹریا ٹھیک ٹھیک ایران کے لئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیدڑ دسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحدیں بدامنی پھیلانی تھی اور ان کی گوشمالی کے لئے اسے بکٹریا گیدڑ دسیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔

(عاشیہ ص ۶۲) ٹی سیاز (Ctesias) ایک یونانی تھا جو ۵۳۹ قبل مسیح سے لے کر ۴۱۳ ق م تک شہنشاہان پارس کا درباری طبیب رہا اور اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھی۔ بعد کے یونانی مورخوں نے اس کے بعض بیانات شبہ کی نگاہ سے دیکھے ہیں اور اس لئے اسے استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو ہیرودوٹس (المتر ۱۲۸۴ ق م) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے، مگر موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہندوستان کی طرف ہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکان سے نیچے اس کے قدم نہیں اترے ہوں گے۔ اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہوں گے۔ کیونکہ دارکے زلزلے میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

شمالی مہم

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یا جرج ماجرج کے حملے ہو کر تے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین) کو دہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (Caucasus) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ اسی راہ سے یا جرج ماجرج آکر اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سد تیسیر کی۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ حتیٰ اذ بلغ بین السدین، و جد من دونہما قوما لایکا دون یفقیہون قولاً (۹۳) یہاں تک کہ وہ دو (پہاڑی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس نظر سے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ سدین سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درہ ہے۔ کیونکہ اس کے دہنی طرف بحر خزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔

جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کے لئے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر فیڈلک سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے پس اگر شمالی قبائل کے حلوں کے لئے کوئی راہ باقی رہی تھی، تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی، اور یقیناً وہیں سے یا جوج باجوج کو دوسری طرف پہنچنے کا موقع ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا، اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران، شام، عراق، عرب، ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔

نقشہ میں یہ مقام دیکھو۔ تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اوپر شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان دو سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے۔ اب اس روک میں اگر کوئی شکاف رہ گیا تھا جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو لانگ سکتے تھے، تو وہ صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذرا القرنین نے اسے بھی بند کر دیا، اور اس طرح



اس نقشہ میں کاکیشیا کی جگہ پر دو دیواروں کی تصویر دکھائی گئی ہے جو اس کی مشرقی اور مغربی طرف سے تھیں۔ ان کی ایک طرف اس نے بحر اسود سے ملنے والی راہ کو بند کر دیا، اور دوسری طرف اس نے بحر خزر سے ملنے والی راہ کو بند کر دیا۔ اس طرح کاکیشیا نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا، اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران، شام، عراق، عرب، ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔

شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح تعقل ہو گیا۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی اور جو بالکل نا سمجھ تھی، وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلہ میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں، اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے۔ پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے "کاسپین" کے نام سے پکارا ہے، اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام بھی "کاسپین" پڑ گیا ہے۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کاکیشیا کے واسطے میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے "کولچی" یا "کول شہ" کے نام سے پکارا ہے، اور دارا کے کتبہ اسطغر میں اس کا نام "کوشیہ" آیا ہے۔ ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یا دونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یا جورج ماجورج کی شکایت کی ہوگی، اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں، اس لئے ان کی نسبت فرمایا کہ — لایکا دون لفقوٹ قولاً — !

لہ دارا یوش اول کا یہ کتبہ تاریخ قدیم کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ اس میں اس نے اپنے تمام مغتوحہ ممالک اور زیر حکومت صوبوں کے نام گنا دیئے ہیں جو تعداد میں ۲۸ ہیں۔ ان میں سے اکثر ناموں کا جغرافیائی محل روشنی میں آچکا ہے۔ صرف ایک دو ناموں کی حقیقت اب تک محل غور و بحث ہے — !

احبابِ اہل

(۴) اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے، وہ اُس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی قیاضانہ سرگرمی ہے، اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الہی ہوا تھا: "یا ذوالقرنین! اما ان تعذب، واما ان تتخذ فیہم حسنا" (۸۶) یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ خواہ سزا دے خواہ انہیں اپنا دوست بنالے۔ یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے پادشاہ کروئس نے تمام عہد و بیان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر بلا وجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا، اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ دقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائید الہی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور تمام لیڈیا مسخر ہو گیا، تو حکم الہی ہوا۔ یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائید الہی نے تیرا ساتھ دیا۔ دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں، لیکن تجھے حملہ نہیں لینا چاہیے۔ وہی کرنا چاہئے جو نیکی اور فیاضی کا مقتضا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا، قال: اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد

الی ربہ فیعذبہ عذاباً نكراً۔ "واما من آمن وعل صالحاً فله جزاء الحسنی ومنتقول له من امرنا یسراً" (۸۸) اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینی چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی بُرائی کرے گا، بلاشبہ اسے سزا دوں گا۔ پھر اسے مرنے ہے اور آخرت کا عذاب سخت بھیلنا ہے۔ اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو ان کے لئے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہوگا، اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ میں بندگان خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو ہو اس طرز عمل کی تعبیر ہے جس کی تفسیر ہیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے، اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔

تمام یونانی مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا، کیونکہ زیادتی ان ہی کی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہتھیار نہ اٹھائیں، اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ کروٹس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں

بھی اسے گزند نہ پہنچائی جائے۔ اگر وہ مقابلہ کرے، جب بھی اُس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہئے۔ اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندوں کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرمانروا خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروٹس کی جگہ سائرس نے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سائرس کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی، کیونکہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کروٹس کو نہ بچا سکے، حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندروں کے ہاتھ سے استعصاب کر لیا تھا، اور ڈلفی کے ہاتھ نے فتح و کامرانی کی بشارت دی تھی۔ پس قدرتی طور پر

لے ہم نے (Oracle) کے لئے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اس کے لئے مرادف لفظ نہیں ہے، لیکن اصطلاح کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔

یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتھ غیبی کی صدائیں سُنی جاتی ہیں، اور خاص بجا ریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور محبا در دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنا دیتے۔

واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لئے خوشگوار نہ ہو سکی، اور اس امر کی
کوشش شروع ہو گئی کہ اس شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی عقیدے کی
شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروٹس کا معاملہ اچانک
ایک پراسرار افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور یونانی دیوتا اپنے سارے
معجزوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے لیڈیا کے باشندوں
کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈلفی کے ہائف کا جواب غلط نہ تھا،
مگر کروٹس نے جنگ کے جوش و طلب میں اس کا صحیح مطلب نہیں
سمجھا۔ ہائف نے کہا تھا "اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی
ملکت تباہ کر دے گا"۔ یعنی خود اپنی ملکیت تباہ کر دے گا، مگر اس نے
خیال کیا، بڑی ملکیت سے مقصود پارسیوں کی ملکیت ہے۔ نیز وہ کہتا
ہے: پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چٹا تیار کی جائے اور
اس پر کروٹس کو بٹھا کر آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ
لگا دی گئی، لیکن پھر جب کروٹس کی بعض باتیں سنیں تو سجدہ متاثر ہوا،
اور آگ بجھانے کا حکم دیا۔ لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو گئی تھی۔
ممکن نہ تھا کہ اسے فوراً بجھا دیا جائے۔ یہ حال دیکھ کر کروٹس نے
اپالو دیوتا کو پکارا، اور باوجودیکہ آسمان بالکل صاف تھا، اچانک
بارش شروع ہو گئی اور اس طرح اس معجزے نے بروقت ظاہر ہو کر

اس کی جان بچالی۔

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصدیقات سے جو حقیقت معلوم
ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروٹس کے عزم و صبر کا
امتحان لینا چاہتا تھا یا یہ بات آشکارا کر دینی چاہتا تھا کہ یونانیوں کے
خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے، اور جن
دیوتاؤں کی مزرعہ بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی، اُن میں
اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچالیں۔
یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے چتا پر بٹھا یا جلے، آگ بھی لگا دی جائے،
لیکن جب وہ خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر
نہیں ہوا، تو پھر اسے بخش دے، اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ
لے جائے۔ دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود ہیروڈوٹس
کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے، اور یونانی افسانہ میں اپالو کے
معجزہ کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ
سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی یونانی افسانہ
نے اس کا توڑ کرنے کے لئے اپالو کا معجزہ گڑھ لیا۔

قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا،
منراپائے گا، جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہوگا اسے انجام ملے گا۔ بعینہ
زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں ہے کہ "وَمَن قَوْل لَّہُ
مَن أَمْرًا یَسِرًّا"۔ اگر لوگوں نے نیک عمل اختیار کی، تو دیکھ لیں گے میرے

احکام و قوانین میں ان کے لئے سختی نہ ہوگی۔ تمام مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لئے سرتاسر شفقت و مرحمت تھا۔ اس نے ان تمام بوجہل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے، اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کئے، وہ زیادہ سے زیادہ نرم زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

(۵) یہ تو صرف اس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں، یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے، ہم وطن نہیں تھے، ہم مذہب نہیں تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی، اور لیڈیا کی شکست یونانی قومیت، یونانی تہذیب، اور سب سے زیادہ یہ کہ یونانی مذہب کی شکست تھی۔ پھر سائرس کے جانشینوں نے براہ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا، اور ہمیشہ کے لئے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سراہی کا شائق ہوگا۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکہوتی صفات کی مدحت سراہی

میں رطب اللسان ہے، اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالمگیر اعتراف و تائید کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست و دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا عقائد پیدا ہو گیا تھا، سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سراہی تھی، اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔

و ملحہ، شہادت بہا ضرا تھا

والفضل ما شہدت بہ الاعداء

زینوفن لکھتا ہے:

”سائرس ایک نہایت دانشمند، بخیدہ اور ساتھ ہی رحم دل فرمانروا تھا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کی شوکت و حشمت سے کہیں زیادہ اس کی عالی حوصلگی اور سیرجشی تھی، اور اس کی فیاضی اور رحم دلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی۔ انسان کی خدمت اور بہرہ دہی اس کی شاہانہ طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے، مظلوموں کو ظلم سے نجات دلائے، در ماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے۔ غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفات کے ساتھ عاجزی اور انکساری

اس کے حسن و کمال کا سب سے بڑا زیور تھی۔ اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے، اور ایک ایسے خزانے کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی، کبھی گوارا نہیں کیا کہ غرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے:

”وہ ایک نہایت ہی مختصر پادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام پادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی، بلکہ جود و سخاوت کا جوش تھا۔ وہ کہتا تھا: سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے اور مظلوموں کی داد درسی ہو۔“

ٹی سیاز لکھتا ہے:

”اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت پادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ رفاه عام کے کاموں میں خرچ کی جائے، اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اسی فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کے لئے خوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوا دیتے۔“

سب سے زیادہ نمایاں بات جو ان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے،

وہ سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوا، اس کی مخلوق نہیں تھا۔ ایک بالائے شخصیت تھی جسے قدرت نے اپنا کر شمع دکھانے کے لئے نمودار کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکم نے اس کی تربیت نہیں کی۔ وقت کے تمدن ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا، اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اسے اٹھایا تھا۔ اس کی تمام ابتدائی زندگی صحراؤں کی گود اور پہاڑوں کی آغوش میں بسر ہوئی۔ وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا، تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ، دانش کا سب سے بڑا پیکر، فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ ان کے سامنے تھا۔

سائرس اور سکندر

سکندر اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا، اور بلاشبہ وہ بہت بڑا فاتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ سائرس کے لئے یہیں کوئی ارسطو نہیں ملتا۔ اس نے انسانی حکمت کی درس گاہ کی جگہ قدرت کی درس گاہ میں پرورش پائی تھی، تاہم اس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی ملکوت کو بھی مستخر کر لیا تھا۔

سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اس کی عمر

تھی، لیکن سائرس کی فتوحات نے جو انہیں جن دی تھیں، وہ دوسو برس تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اس کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اس کی مملکت روز بروز وسیع و مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خانی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند کینقباد نے اسے بھی بھر دیا، اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی وہ عالمگیر سلطنت ظہور میں آگئی جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر سائرس کا جانشین دارا یوش تن تنہا حکمراں تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں جنہیں قہر و طاقت نے سر کیا تھا، لیکن سائرس کی فتوحات رفح و دل کی فتوحات تھیں جنہیں انسانیت و فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اٹھاتی ہے لیکن ٹک نہیں سکتی۔ دوسری ٹک جاتی ہے اور پھر ٹپکتی نہیں۔

سائرس فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت عرب سے لے کر بحر اسود تک اور ایشیائے کوچک سے بلخ تک پھیلی ہوئی تھی، اور ایشیا کی تمام قومیں اس کے ماتحت آچکی تھیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی نہیں ہوا، کیونکہ زمین و فن کے لفظوں میں "وہ صرف پادشاہ ہی نہ تھا بلکہ انسانوں کا شفیق مرنی اور قوموں کا رحیم باپ تھا۔" اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت کر سکتی ہے لیکن اولاد اپنے شفیق

باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی، یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر رومن ایمپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے پادشاہوں کی سخت گیری، قساوت قلبی، اور ہیبت انگیز طریق تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سائرس کے عہد میں نہیں ملتی۔

یاد رہے کہ یہ محض قدیم یونانی مورخوں کی روایات ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے تمام محققین تاریخ کی تاریخی مسلمات ہیں۔ بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت، اور اخلاق و انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا، اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی۔ بی۔ گرنڈی (G. B. Grundy) جو موجودہ زمانہ میں تاریخ قدیم کے ایک متقدم ماہر ہیں اور جن کی کتاب "گرینڈ پرسیان وار" (Great Persian War) نہایت مقبول ہو چکی ہے، لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اس نے اپنی تمام معاصر قویوں

کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کر دیا۔ اس کی ابتدائی نشوونما بالائی فارس کے غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی جس کی سرگزشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن کے ماقول ہیں جو سقراط کا شاگرد تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کے فضائل انسانیت کا جو ہر عام طور پر نمایاں ہے۔ خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں، خواہ نہ دیں، تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کی تدبیر و سیاست کا دامن اس کی انسانی و فضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا، اور جب یہ خصوصیت آشوری و بابلی شہنشاہوں کی بدعملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے تو اس کی شریفانہ نمود اور زیادہ درخشندہ ہو جاتی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

یہ نئی حقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست افشان کا ایک گنہگار رئیس تھا، اور اب ایشیا کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر سرمان تھیں جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظیمیں ظہور میں آچکی تھیں۔ ان تمام بادشاہتوں میں جنھوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے

نرمز فن
سقراط کا
شاگرد تھا

کئے، ایک پادشاہت بھی ایسی نہ تھی جو اس اپنی ہستی کا کوئی مؤثر ظہور رکھتی ہو۔ آکاڈی مملکت کے نیم منہائی سارگون سے لے کر بونکر راز (بخت نصر) تک، سب کی مملکتیں اس کے آگے سر بسجود ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا۔ وہ ایک بڑا حکمران تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ ان دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گزرے اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ اس کی رعایا پر اس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا، لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔ اس کی حکومت قتل و سلب کی سزاؤں سے بالکل نا آشنا رہی۔ اب تازیانوں سے مجرموں کو نہیں بیٹھا جاتا تھا، اب قتل عام کے احکام صادر نہیں ہوتے تھے، اب قوموں اور قبیلوں کو جلا وطن نہیں کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی پادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم محو کر دیئے۔ جلا وطن قومیں اپنے وطنوں میں لوٹائی گئیں، ان کے معبد اور معبود انھیں واپس دے دیئے گئے، قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر و تشدد باقی نہیں رہا، ہر قوم کے ساتھ پوری طرح داد دہی کی گئی

ہر مذہب کے پیروؤں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی، دنیا کی
گزشتہ عالمگیر دہشت ناک کی جگہ ایک عالمگیر رواداری اور
عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا۔

غور کرو قرآن نے چند نعتوں کے اندر جو اشارات کر دیئے ہیں آج
تاریخ کا داستان سراسر اس طرح اس کے ایک ایک حرف کی شرح و
تفصیل سن رہا ہے۔

(۶) اب چند لہجوں کے لئے ان تصریحات پر غور کرو جو تورات کے
صحائف میں مندرج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی
خصوصیت واضح کر رہے ہیں، اور کس طرح قرآن کے اشارات بھی ٹھیک
ٹھیک اُن کی تصدیق ہیں؟ یسعیاہ بنی کی کتاب میں ہے کہ: "خداوند کہتا
ہے: خورس میرا چرواہا ہے" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ "وہ میرا مسیح ہے"۔
اور یرمیاہ بنی کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات
دلائے گا۔ اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منظر
نجات دہندہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟

جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سائرس کے

لے پروفیسر موبٹ کے اس مقالہ کے لئے یونیورسٹی آف دی ورلڈ کی دوسری
جلد صفحہ ۱۰۸ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو جے اے ہمرٹن (J. A. Hammerton)
نے مرتب کی ہے اور حال میں شائع ہوئی ہے۔

حالات پر نظر ڈالتے ہیں، تو یہ اول نظر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی
ہے کہ اُس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا جس
کے لئے وقت کی تمام قومیں چشمِ براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار ان کی زبانوں
پر نہیں ہوتا۔ ان کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔ غور کرو،
اُس عہد کی زرقار زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صحن تمدن کی وہ
نود تھی، جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی
ہوئی دیکھتے ہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت تک انسانی فرمانروائی
کی عظمت صرف قہر و غصب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی، اور سب
سے بڑا حکمران وہی سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کے لئے
خوفناک ہو۔ آشور بنی پال فینو کا سب سے بڑا پادشاہ تھا، اس لئے
کہ وہ شہروں کے جلائے اور آبادیوں کے دیران کرنے میں سب سے
زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشاۃ ثانیہ میں بنوکدر زار سب سے بڑا
فاتح تھا۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور ملکوں کی دیرانی میں سب
سے زیادہ قہرمان تھا۔ مصریوں، آکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں،
اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوفناکی اور
دہشت انگیزی کے مظاہر تھے، اور ان کی شخصیتوں نے دیونائی الوہیت
کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل
کر لیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنوکدر زار کی شہنشاہی
کا ظہور ہوا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر بیہم تین حملے

کر کے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زرخیز علاقہ تاراج و ویران کر دیا، بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہٹکا کر بابل لے گیا کہ جوزیف کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو نہ بچ میں نہیں لے جاتا" پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لئے چشم براہ ہو؟ قومیں ایک نجات دہندہ کی تلاش کر رہی ہوں؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسانوں کے گئے گئے لئے خدا کا بھیجا ہوا چڑھا ہو جو ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بوجھ ہلکا کر دے، جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے دے کہ انسانی حکمرانی نوع انسانی کی خدمت کے لئے ہونی چاہئے۔ وحشت انگیزی اور خوفناکی کے لئے نہیں۔

دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں سے تنگ آچکی تھی۔ اب وہ ایک "چرواہے" کے لئے مضطرب تھی اور یسعیاہ نبی کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چرواہا نمودار ہو گیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں زینوفن کے لفظوں میں "قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کے لئے بے اختیار لپکیں" کیونکہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا، اور اگر مات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبح سعادت کی اس جہان تابانی کا استقبال نہ کیا جاتا۔

غور کرو یسعیاہ نبی کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو ہو تصور یہ ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہوگا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ میں اس کا دہنا ہاتھ پکڑ کے قوموں کو اس کے قابو میں دے دوں گا اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلاؤں گا۔ میں اس کے آگے چلوں گا۔ بیڑے راستے اس کے لئے سیدھے کر دوں گا۔ سارے موترخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک چرواہے کی طرح آیا اور اس نے بندگان خدا کی رکھوالی کی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا، اس کی شقاوت ختم ہو گئی، وہ جس قوم کی طرف بڑھا، اس کی بیڑیاں کٹ گئیں، اس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اس کے سارے بوجھ ہلکے ہو گئے۔ وہ صرف بنی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی میں اسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے اور تورات کی اصطلاح میں "مسیح" وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کے لئے برگزیدہ کر لے، اور خدا کے براہ راست مسموح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد کی نسبت بھی آیا ہے کہ "مسیح" تھے، سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لئے ایک آخری مسیح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو مسیح "کبزا بلاشبہ اس کے تقدس اور الٰہی برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے۔

(۷) اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے، وہ

اس کا ایمان بالہد ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں کہ وہ ایک خدا پرست انسان تھا، آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکام الہی کے مطابق عمل کرتا تھا، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا؟ لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟ یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور مسیح کہا، اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان ہستی نہیں ہو سکتی۔ جس کا "داہنا ہاتھ خدا نے پکڑا ہو" اور جس کی "یڑھی راہیں وہ درست کرتا جائے" یقیناً وہ خدا کا ناپستمدیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑتا ہے جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف ان ہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اس کے چنے ہوئے اور اس کی مٹھرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

اسرائیلی نبیوں کی شہادت

آج کل کے اصحاب نقد و نظریہ عیساہ بنی کی اس پیشین گوئی کو مستحب سمجھتے ہیں، کیونکہ یائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے، جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے، ان کی شہادتیں موجود ہیں اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ خرفیل اور دانیال یائرس کے معاصر تھے۔ اور دارا کے عہد تک زندہ رہے۔ ان دونوں کی تصدیحات سائرس کی نسبت موجود ہیں۔ پھر دارا کے زمانہ میں بھی اور ذکر کیا ہے کے صحیفے مرتب ہوئے، اور زرکیس (اردشیر یا ارتخشست) کے عہد میں غذا اور نغیاہ کا ظہور ہوا۔ ان سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں، اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس بنی اسرائیل

کی ایک موعود ہستی تھی اور خدا نے اسے برگزیدگی کے لئے چن لیا تھا۔ اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا، تو کیا ایک لمحہ کے لئے یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرات کرتے؟ فرض کرو، یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں اور یہودیوں ہی میں پھیلیں، حتیٰ کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں۔ پھر کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست انسان کے لئے ایسی پیشین گوئیاں بنائی جاسکتیں؟ کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست کو اسرائیلی وحی کا مروج اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنا دیا جاتا؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اجنبیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا۔ ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ اور کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی یہی عصبیت انھیں اعتراف حق سے روکتی تھی کہ "ولتؤمنوا، الا لمن تبع دینکم" (۳: ۷۳) تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو ان کے لئے ہر اعتبار سے اجنبی تھا، اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا، بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کے لئے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی، اور اس کی فضیلتیں ایسی قطعی

اور آشکارا تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لئے جو اجنبی بھی ہو، یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انھیں نجات دلائی تھی، تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے مگر خدا کا مسح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے اس کی فضیلتیں مذہبی ہوں۔ ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد کا توافق موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ ہے، اور ممکن نہیں کہ ایک ایسے انسان کے لئے ہو جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟

تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیر و تھا، جسے یونانیوں نے زاردست روئے کے نام سے پکارا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غالباً اسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم عجمی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تعمیری کی تھی۔ وہ ایران میں نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔

زردشت کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ

کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے، اور انیسویں صدی کا پورا زمانہ مختلف نظریوں اور قیاسوں کی رد و کد میں بسر ہو چکا ہے۔ بعضوں کو اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا۔ بعضوں نے اس کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھادی۔ اسی طرح محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلدز کی رائے پر متفق ہو گئے ہیں، اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا۔ اور گشتاسپ لے والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران یعنی آذربائیجان میں ہوا جسے اوستا کے حصہ ویندی داڈ میں "ایریانیہ و بوجوے" تعبیر کیا ہے، البتہ کامیابی باختر میں ہوئی جس کا گورنر گشتاسپ تھا۔

لے گشتاسپ کو یونانیوں نے ہستاسپیز (Hystaspes) لکھا ہے۔
 ۱۷۷۰ء۔ وی۔ ویس جیکسن پروفیسر کوئینز کالج کی کتاب انٹرویو پرشیا اینڈ ہینڈ بک
 (Ancient Persia & his Prophet) کا مطالعہ ان باب میں کفایت کرے گا۔

اس تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہئے۔ اور سائرس کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۵۰ ق۔م میں ہوئی۔ یعنی زردشت کی وفات کے بیس سال بعد یا عین اسی سال۔

لیکن اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا، تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کئے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیئے ہیں۔ تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے، اور اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا، بلکہ اس کا پہلا حکمران داعی تھا، اور اسی نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑا جو دوسو برس تک بلا امتنا دین زردشتی پر عمل پیرا رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات سے پڑتی ہے وہ دو ہیں، اور دونوں کی تاریخی نوعیت مسلم ہے۔ پہلا واقعہ "گوماتہ" کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا کے کتبے ہیں جن سے اس کے دینی عقاید کی نوعیت آشکار ہو گئی ہے۔

سائرس کا بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمبیسیز (کمبوجیہ یا کیمباد) تخت نشین ہوا۔ اس نے ۵۲۵

ق۔ م میں مصر فتح کیا۔ لیکن ابھی مصر ہی میں تھا کہ معلوم ہوا، ایران میں بغاوت ہو گئی ہے اور ایک شخص "گوماتہ" نامی نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا لڑکا سمرڈیز (فارسی: بروید) مشہور کر دیا ہے جو بہت پہلے مرجحکا تھا یا مارڈالا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا لیکن ابھی شام میں تھا کہ ۵۲۲ قبل مسیح میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چونکہ سائرس کی براہ راست نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا۔ اس لئے اس کا عم زاد بھائی دارا بن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی، گوماتہ کو قتل کیا اور نئی مملکت کو اس کے عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ دارا کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۲۱ قبل مسیح میں ہوئی ہے۔ پس اُس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا۔

یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغاوت تھی اور خود دارا اپنے کتبہ بے ستون میں "گوماتہ" کو "موگوش" لکھتا ہے یعنی مجوس اور مجوسی مذہب سے متصف۔
قدیم مذہب ہے۔ لہ

لہ موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں بھی آیا ہے، اور یہ بات اب قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ "موگوش" سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیرو ہیں جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغاوت "پراؤریش" نامی مجوس نے کی تھی جسے دارا نے ہمدان میں قتل کیا، اور تیسری "ہخترت ختمہ" نامی نے جو اریہل میں قتل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ دارا نے بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر سکا۔ ان میں سب سے اہم کتبہ بے ستون کا ہے۔ جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگزشت قلمبند کی ہے۔ دوسرا استخر کا ہے، جس میں اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے ہیں۔ ان دونوں میں وہ بار بار "اہور موزدہ" کا نام لیتا ہے، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اُس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ "اہور موزدہ" زردشت کی تعلیم کا "اللہ" ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) چونکہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں موگوش مشہور ہو گئے تھے اس لئے عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہو گیا اور موگوش نے مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کہنے لگے۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اصلاً مجوسی زردشتیوں کے مخالف تھے۔

ان دو واقعوں پر ایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کر دینا چاہئے۔
یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ کم بنی سیز نے کوئی نیا دین
قبول کیا تھا، یا دارا کو اس طرح کا کوئی معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیروڈوٹس
نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے۔ لہ
اس کے لئے دارا کے عہد کے واقعات بالکل قریبی زمانے کے واقعات
تھے، اور یلیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیوں
اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے
واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پس سائرس کی وفات اور دارا کی تخت نشینی
کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گزری ہے، ہم دونوں کے ساتھ
کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں کسی نئی مذہبی دعوت کے طور پر قبول
کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔

اب غور کرو، ان واقعات کا لازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اگر سائرس
کے بعد کم بنی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی، اور
دارا دین زردشتی پر عامل تھا، تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا کہ دارا
اور کم بنی سیز سے پہلے زردشتی دین خاندان میں آچکا ہے؟ اگر سائرس
کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لئے بغاوت کرتے

لہ دارا کی وفات بالاتفاق ۴۸۴ قبل مسیح میں ہوئی، اور ہیروڈوٹس ۴۸۴ ق م
میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد۔

ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا ہے، تو کیا یہ اس بات کا ثبوت
نہیں ہے کہ سائرس نیا مذہب قبول کر چکا تھا، اور تبدیل مذہب کا
معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا، تو
کیا یہ اس بات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب سے پہلے سائرس ہی نے
یہ دعوت قبول کی تھی، اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا اور
نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟

زردشت اور سائرس

اتنا ہی نہیں، بلکہ ہم غور کرتے ہیں تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے
تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی
جرات نہیں کریں گے۔ اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا، اور سائرس
کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور کم نامی میں بسر ہوا، تو کیا اسی
زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں؟
اور کیا ایسا نہیں سمجھا جاسکتا کہ اسی زمانہ میں سائرس زردشت کی تعلیم
وصحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت
تاریخ کی ایک لم شدہ داستان ہے۔ پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں
ان دونوں شخصیتوں کی معاشرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا؟

مورخ زینوفن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا فسانہ ہمیں سنایا ہے
اس افسانہ میں ایک پراسرار شخص کی پرچھائیں صاف نظر آرہی ہے۔

جودشت و جبل کے اس پروردہ قدرت کو کسے ولے کارناموں کے لئے تیار کر رہا تھا۔ کیا اس پر چھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران میں ہوا تھا، اور اگر سائرس کی ابتدائی گننامی کا زمانہ بھی شمالی کوهستانوں میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شدہ داستان کا سراغ نہ بن جائیں؟

سائرس کی شخصیت و قت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، اور صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔

بہر حال سائرس نے اپنی ابتدائی گننامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی، یا تخت نشینی کے بعد، لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زردشتی بن چکا تھا۔

دین زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر دو القرنین دین زردشتی پر عامل تھا، اور قرآن و آلقرنین کے ایمان باشد اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اسے ملہم من اللہ قرار دیتا ہے، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن

کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں، کیونکہ حقیقت اب پوری طرح روشنی میں آچکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سترتا سر خدا پرستی اور نیک عمل کی تعلیم تھی، اور آتش پرستی اور ثنویت کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے، بلکہ قدیم میدوی جو سیت کا رد عمل ہے۔

جس طرح روم کی مسیحیت قدیم رومی بت پرستی کے رد عمل سے محفوظ نہ رہ سکی، اسی طرح زردشت کی خالص خدا پرستانہ تعلیم بھی قدیم جو سیت کے رد عمل سے بچ نہ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ از سر نو مدون ہوئی تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو انڈو یورپین آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریوں کی طرح ایران کے آریوں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا۔

میں آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کر لی، کیونکہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی، دونوں ظہور میں آتی تھیں، لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قوت پاک روحانی ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں

بخشتی تھی، دوسری فوت برائی کے عسرتیوں کی تھی جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی اور شیطانوں کی تاریکی میں۔ نور و ظلمت کی یہ کشمکش سے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیوں کی خود ہے اس لیے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اسی کے لیے ہونی چاہئیں۔ اس روشنی کا مظهر آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔

اچھائی برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربانیاں بنائی جاتی تھیں، اور اس کے خاص بجا ریوں کا ایک مقام گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد موگوٹش کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اسی لقب نے آئس پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا۔

لیکن زردشت نے ان تمام عقائد سے انکار کر دیا، اُس نے خدا پرستی، روحانی سعادت و شقاوت، اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ پیدا کیا۔ اُس نے کہا: یہاں نہ تو خیر کی بہت سی روحانی ہستیاں ہیں نہ شر کے بہت سے عسرت۔ یہاں صرف ایک "اہور مزورہ" کی ہستی ہے جو یگانہ ہے، نور ہے، قدوس ہے، حق ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، او تمام کائنات ہستی کی خالق ہے۔ کوئی ہستی نہیں جو اس کے مثل ہو،

یا اُس کے ہمتا ہو، یا اس کی شریک ہو۔ تم نے جن روحانی قوتوں کو خیر کا خالق سمجھ رکھا ہے، وہ خالق و قادر نہیں ہیں بلکہ "اہور مزورہ" کے پیدا کئے ہوئے "امش سپند" ہیں۔ یعنی ملائکہ ہیں۔ اور شر کا ذریعہ دیوؤں کی خوفناک قوت نہیں ہے، بلکہ "اند مین" (دھرم) کی ہستی ہے۔ یعنی شیطان کی ہستی ہے۔ یہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے انسان کو تاریکی کی طرف لے جاتی ہے۔

زردشت کی تعلیم کا علی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ یونانیوں کی طرح اس کا اخلاقی تصور مذہب سے الگ نہیں تھا بلکہ عین مذہب میں تھا۔ اس نے مذہب کو محض ایک قومی اور ملکی مذہب کی شان نہیں دی، بلکہ انفرادی زندگی کا روزانہ دستور العمل بنا دیا۔ نفس کی طہارت اور اعمال کی درستگی اس کی تعلیم کا اصلی محور ہے۔ انسانی زندگی کا ہر خیال، ہر قول، ہر فعل ضروری ہے کہ اس میار پر پورا اترے۔ فکر کی راستی، گفتار کی راستی اور کردار کی راستی پرستاران اہور مزورہ کے لئے تین بنیادی اصول تھے۔ پرنسپل سرگزندی کے نغظوں میں اُس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا۔ اس نے مذہب کو اپانوں کی روزانہ زندگی کی ایک حقیقت بنا دیا، اور اخلاق اس مذہب کا مرکز بنی ہوئے تھے۔

اس کی عبادت کا تصور ہر طرح کے اعنائی اثرات سے پاک تھا۔

عبادت ہیں اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ خدا کے غضب و انتقام سے بچیں، بلکہ اس لئے کہ برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ اگر ہم اہوروزہ کی عبادت نہیں کریں گے تو وہ ہیں یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کی طرح اپنے غضب کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ لیکن خود ہم سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

اس کی تعلیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو آخرت کی زندگی کا اعتقاد ہے۔ وہ کہتا ہے: انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس دنیا میں گزرتی ہے۔ اس کے بعد بھی ایک زندگی پیش آئے گی۔ اس زندگی میں دو عالم ہوں گے۔ ایک چھائی اور سعادت کا۔ دوسرا برائی اور شقاوت کا۔ جن لوگوں نے اس زندگی میں نیک عمل کئے ہیں، وہ پہلے عالم میں جائیں گے۔ جنہوں نے برے عمل کئے ہیں، دوسرے عالم میں۔ اور اس کا فیصلہ اُس دن ہو گا جسے وہ آخری فیصلہ کا دن قرار دیتا ہے۔

بقائے روح کا مسئلہ اس کے مذہب کی بنیادی جڑ ہے۔ انسان فانی ہے مگر اس کی روح فانی نہیں۔ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اور ثواب و عقاب کے دو عالموں میں سے کسی عالم میں داخل ہو جاتی ہے۔

موجودہ عہد کے تمام محققین تاریخ متفق ہیں کہ زردشت کی تعلیم نے انسان کے اخلاقی اور مذہبی ارتقاء میں نہایت موثر حصہ لیا ہے، اُس نے پانچ سو برس قبل مسیح ایرانیوں کو اخلاقی پاکیزگی کی ایک ایسی سطح پر

پہنچا دیا تھا جہاں سے اُن کے معاصر یونانیوں اور رومیوں کی زندگی بہت ہی پست دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسا مذہب جس کی تعلیم کا رخ ستراسر انفرادی زندگی کی پاکیزگی کی طرف تھا اور جو اپنے پیروؤں کی اخلاقی روش کے لئے نہایت بلند مطالبے رکھتا تھا، ضروری تھا کہ اعمال و خصائل کے بہتر سانچے ڈھال دے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ اس نے ڈھال دیئے تھے۔ یہ شہادت کن لوگوں کے قلم سے نکلی ہے؟ ان لوگوں کے قلم سے جو کسی طرح بھی ایرانیوں کے دوست نہیں سمجھے جاسکتے پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا تمام زمانہ ایرانیوں اور یونانیوں کی مسلسل آویزش کا زمانہ رہا ہے، اور ہیرودوٹس اور زینوفن نے جب تاریخیں لکھی ہیں، تو یونان کے حریفانہ جذبات پوری طرح ابھرے ہوئے تھے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کی اخلاقی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے۔ انھیں ماننا پڑتا ہے کہ ان میں بعض ایسی عظیم فضیلتیں رکھتے تھے جو یونانیوں میں نہیں پائی جاتیں۔

ہم یہاں پر دوسرے گزندی کے الفاظ پھر متعارف کریں گے کہ:

”ایرانی سچائی اور دیانت کی ایسی فضیلتیں رکھتے تھے جو اس

عہد کی قوموں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتی۔“

ان کی راست بازی، رحم دلی، شجاعت اور بلند نظری کا سب اعتراف کرتے ہیں، اور یہ یقیناً زردشت کی تعلیم کے لازمی نتائج تھے۔

دارا کے فرامین

دارا کے اولیٰ کا زمانہ اس مذہب کی بلند آہنگی کا شاندار زمانہ ہے اس کے کتبوں میں ہیں زردشتی تعلیم کی صدائیں صاف ستائی دے رہی ہیں اور ان سے ہم حقیقت حال معلوم کر لے سکتے ہیں۔ استخر کا کتبہ ذہابی ہزار برس پیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کر رہا ہے:

"خدا کے بزرگ و برتر اہور موزدہ ہے۔ اسی نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا، اسی نے انسان کی سعادت بنائی، اور وہی ہے جس نے دارا کو جہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا"

دارا اعلان کرتا ہے کہ:

"اہور موزدہ نے اپنے فضل سے مجھے پادشاہت دی۔ اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن و امان قائم کیا۔ میں اہور موزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے، میرے خاندان کو، اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اسے اہور موزدہ! میری دعا قبول کر!"

"اے انسان! اہور موزدہ کا تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچنا رہ۔"

یاد رہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا، اور اس کی وفات سے صرف آٹھ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صدائوں میں ہم خود سائرس کی صدائیں سن رہے ہیں۔ اس کا بار بار اپنی کامرائیوں کو اہور موزدہ کے فضل و کرم سے منسوب کرنا ٹھیک ٹھیک ذوالقرنین کے اس طریق خطاب کی تصدیق ہے کہ ہذا رحمۃ من ربی (۹۸)۔

لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد زردشتی مذہب کا تنزل شروع ہو گیا۔ ایک طرف قدیم مجوسی مذہب نے آہستہ آہستہ سراٹھایا۔ دوسری طرف خارجی اثرات بھی کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انٹنین

(Antonine) شہنشاہ روم کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائرس اور دارا کے عہد کے زردشتی مذہب نے بالکل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر سکندر اعظم کی فتوحات کا سیلاب اٹھا، اور وہ ایران کی دو صد سالہ شہنشاہی ہی نہیں بلکہ اس کا مذہب بھی بہا لے گیا۔ ایرانیوں کا قومی افسانہ کہتا ہے کہ زردشت کا مقدس صحیفہ اوستا بارہ ہزار بیلوں کی مدد سے لکھا ہوا تھا جو سکندر کے حملہ استخر میں جل کر رہ گئے۔ بارہ ہزار بیلوں کی کھال کا قصہ تو محض مبالغہ ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس نے جو سلوک تورات کے ساتھ کیا تھا، وہی سکندر کے حملہ ایران نے اوستا کے ساتھ کیا۔ یعنی دونوں جگہ مذہب کا اصلی نوشتہ مفقود ہو گیا۔

پھر جب پانچ سو پچاس برس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہوا، تو مذہب زردشت کی ازسرنو تدوین کی گئی، اور جس طرح قید بابل کے بعد عزرائیل نے نئی تورات مرتب کی تھی، اسی طرح اردشیر بابکانی نے ازسرنو اوستا کا نسخہ مرتب کرایا، لیکن اب مذہب کی تمام حقیقی خصوصیات طرح طرح کی تبدیلیوں، تحریفوں اور اضافوں سے ایک قلم منسوخ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ساسانی عہد کا مذہب قدیم مجوسیت، زردشتیت اور یونانیت کا ایک مخلوط مرکب ہے۔ اور اس کا بیرونی رنگ دروغ تو تمام تر مجوسیت ہی نے فراہم کیا ہے۔ اسی ساسانی اوستا کا ایک ناقص اور محرف ٹکڑا ہے جو ہندوستان کے پارسیوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اور جس کے لئے ہم ایک فریج مشرقی آنک تیل کی اولوالعزمیوں اور علمی قربانیوں کے شکر گزار ہیں۔

اہور مزورہ کی مزعومہ تشبیہ

اس سلسلہ میں ایک بحث طلب سوال اور ہے، اور ضروری ہے کہ اس پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ یہ مسلک ہے کہ پیردان زردشت میں بت پرستی کی کوئی شکل بھی سر نہ اٹھا سکی۔ قدیم مجوسی مذہب میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایران میں دارا اور اس کے بعد کے عہد کے جو آثار ملے ہیں، ان میں ایک خاص صورت کا نقش پایا جاتا ہے۔ یہ پادشاہ کی تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ پادشاہ کی شخصیت

مرقع میں الگ نمایاں ہے۔ اس کا محل ہر جگہ بلندی میں اور سب سے اوپر واقع ہوا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ خود پادشاہ سے بھی ایک بلند تر ہستی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کون ہستی ہے؟ سب سے پہلے یہ صورت بے ستون کے مرقع میں زیر بحث ہوئی، جب ۱۸۴۷ء میں کرٹیل رالینسن نے اپنی شرح وحل کے ساتھ اصل مرقع کا چربہ شائع کیا۔ پھر یہی صورت متعدد نقوش میں ملی۔ مثلاً دارا کی سرکاری مہر کے مرقع میں، نقش رستم میں جو دراصل دارا کی قبر ہے۔ استخر کے محل شاہی کے دروازہ پر جو غالباً درمیانی دروازہ ہے۔

رالینسن سے پہلے سر رابرٹ کیر پورٹر نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ یہ کوئی مافوقی انسانیت ہستی ہونی چاہئے جو خود پادشاہ سے بھی اوپر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ رالینسن ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ اہور مزورہ کی ہستی ہے، یعنی خدا کی۔ چنانچہ اس وقت سے یہ رائے براہِ مقبول ہوتی گئی۔ اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایرانی اگرچہ بت پرستی سے مجتنب رہے، لیکن انھوں نے اہور مزورہ کی ہستی کے لئے ایک رموز (یعنی Symbolic) شخص کا تصور ضرور قائم کر لیا تھا جو ان تصویروں میں نمایاں ہے، اور یہ مصریوں اور آشوریوں کے رموز تجسم کا اثر تھا جس سے وہ بھی متاثر ہو گئے۔ لہ

لہ عام رائے یہی ہو گئی ہے، لیکن ایسی صدائیں برابر اٹھتی (باقی اگلے صفحہ پر)

لیکن ۱۹۱۲ عیسوی سے (جب کہ میں نے پہلے پہل ایرانی آثار قدیمہ کا بغور مطالعہ کیا) میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قیاس اول دن سے غلط رخ پر چلا ہے اور تمام تاریخی اور عقلی قرائن اس کے خلاف ہیں۔ اولاً تمام تاریخی شہادتیں اور خود پارسیوں کا مسلسل تعامل ثابت کر رہا ہے کہ انھوں نے الوہیت کا تصور کبھی کسی انسانی جسم و صورت میں نہیں کیا، اور کبھی کسی مجسمہ کو تقدیس کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ثانیاً اگر امتداد زمانہ سے یہ چیز پیدا بھی ہو گئی ہو، جب بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ خود دارا کے عہد میں پیدا ہو گئی ہو، جو زردشت کی تعلیم کا ابتدائی عہد تھا اور جب یونانی مورخوں کی شہادت کے مطابق، ایرانی یونانی بُت پرستی کو حقارت کی

دیکھی صفحہ کے حاشیہ کا بقیہ) رہی ہیں جنہیں اس لئے سے اختلاف ہوا مگر نسل رالین سن کی اشاعت کے چند سال بعد لغات شرقیہ کے ایک عالم ریوزنڈ چارلس فارسٹر (Forster) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر اس نقاش کی ہے جس نے مرقع نقش کیا تھا اور جو حلقہ اس کی کمر کے گرد نظر آ رہا ہے یہ سماروں کی ٹوکری ہے جس میں بیٹھ کر بلندی پر کام کیا کرتے تھے۔ دیکھو مصنف مذکور کی کتاب

One Primeval Language جلد سوم صفحہ ۱۷۹

نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ثالثاً اس شبیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو عبودیت والوہیت کی کوئی خاص شان رکھتی ہو۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی صورت اور وضع ہے، اور وہ ایک معمولی انسان کی ہے جس نے اس زمانے کا عام لباس پہن رکھا ہے۔ وہی لباس جو خود دارا اور اس کے جانشینوں کا تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنی بات اس میں زیادہ ہے کہ ایک حلقہ اس کی کمر سے نیچے چاروں طرف بنا دیا گیا ہے، اور عقب میں ایک ایسا طولانی نقش ہے جس میں لہروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس حلقہ اور لہروں کو سورج کی رموز شکل قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے، جب بھی یہ اس کے لئے کافی نہیں کہ محض یہ شبیہ حلقہ اور مشتبہ لہریں ایک خالق ہستی کے تصور کے لئے پسگردان زردشت کا منہائے خیال تھا۔

رابعاً اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس حلقہ اور لہروں میں ایک ماورائے انسانیت ہستی کا تصور رموز تھا۔ جب بھی یہ اہور مزوہ کی ہستی کیوں ہو، جس کی نسبت زردشت نے تقدیس و علاؤ کا اس درجہ بلند تصور قائم کیا ہے، کیوں یہ کسی ایسے انسان کی صورت نہ ہو جو اگرچہ انسان تھا مگر اپنی انسانیت کی رفعت و تقدیس کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہستی سمجھا جاتا تھا! مثلاً خدا کی ایک فرستادہ ہستی۔

بہر حال اس رخ پر ہم جس قدر بڑھتے ہیں، یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ اسے اپور موزہ کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ یہ یا تو خود زردشت کی تصویر ہے جو ایرانی مذہب کا بانی تھا، یا سائرس کی ہے جو اس مذہب کا حکمران پیغمبر اور ہخامنشی شہنشاہ کا پہلا تاجدار تھا۔

چونکہ اس صورت کے بائیں ہاتھ میں ہر جگہ ایک حلقہ دکھایا گیا ہے اور قدیم تصورات میں حلقہ کی شکل حکومت و مالکیت کی علامت سمجھی جاتی تھی اس لئے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سائرس کی تصویر ہو لے

لے ۱۹۱۳ء میں نے اپنا یہ خیال مسٹر ڈورڈ براؤن، پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی و مصنف لٹری ہسٹری آف پرشیا وغیرہ

(Mr. Edward Brown, Professor Cambridge University & Author Literary History of

Persia) کو لکھا تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا، اور بہت اصرار کے ساتھ لکھا تھا کہ بعض مشرقین جرمنی سے اس بائیں میں مرسلت کروں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے لکھا، وہ خود اس بائیں میں خط و کتابت کر رہے ہیں لیکن اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہوئی اور میری خط و کتابت کا سلسلہ سنسکرت کی سخت گریوؤں باطل شدہ کر دیا۔ پھر میں نظر بند ہو گیا، اور جب چھوٹا تو اس کے چند دنوں بعد ان کے انتقال کی خبر آگئی۔

کیا ذوالقرنین نبی تھا؟

جہاں تک قرآن کی تصریحات کا تعلق ہے ایک اہم سوال اور باقی رہ گیا ہے۔ قرآن میں ہے: "قلنا یا ذوالقرنین"۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین۔ اس خطاب کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین براہ راست وحی الہی سے مخاطب تھا؟ مفسرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں، اور چونکہ امام رازی سکندر مقدونی کو ذوالقرنین بنانا چاہتے ہیں اور وہ بنتا نہیں، اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں قلنا کے منطوق پر اس کے مفہوم کو ترجیح دیں۔

اس میں شک نہیں کہ قلنا کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بالواسطہ خطاب ہو۔ یعنی اس عہد کے کسی پیغمبر کے ذریعہ ذوالقرنین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ جیسا کہ قلنا اضر لہ بعضہا (۴: ۳۴) میں ہے۔ یا خطاب قولی نہ ہو، تکوینی ہو۔ جیسا کہ قیل یا ارض ابلعی ما وک دیا سماء اقلعی (۱۱: ۴۴) اور قلنا

یا نار کوئی بردا مسلماً علیٰ ابراہیم" (۶۹:۲۱) وغیرہ آیات میں ہے۔
لیکن اس طرح کا مطلب جب ہی قرار دینا چاہئے کہ اس کے
لئے قومی وجوہ موجود ہوں۔ اور یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ آیت
کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ نے براہ
راست مخاطب کیا، اور اس پر اللہ کی وحی نازل ہوئی تھی۔
باقی یہ بات کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی یا اُس طرح کی وحی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی
والدہ کی نسبت بیان کی گئی ہے کہ "واوحینا الیٰ موسیٰ ان ارضینہ"
(۷:۲۸) تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے
کہ ذوالقرنین نبی تھا۔ اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ
اور اُن کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اس تفسیر کی تائید
کرتے ہیں۔

اور غور کرو، قرآن کا یہ بیان سائرس کی شخصیت پر کس
طرح ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہا ہے؟ تاریخ اس کی پیغمبرانہ
شخصیت کی شہادت دے رہی ہے، اور عہد قیق کے انبیاء
اسے صریح خدا کا برگزیدہ، اس کا مسیح اور اس کی مرضی پورا کرنے
والا کہہ رہے ہیں۔ عزرائیلی کی کتاب میں اس کا جو فرمان
تعمیر بیت المقدس کے لئے نقل کیا گیا ہے، اُس میں وہ خود اعلان
کرتا ہے: "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیہ کے ملک میں اس کی عبادت
کے لئے ایک ہیکل تعمیر کروں۔" اس کا یہ کہنا ہے کہ: "خدا نے

مجھے حکم دیا ہے" ٹھیک ٹھیک قلنا یا ذوالقرنین کی تصدیق ہے۔ ہم
اس سے پہلے اس کی خدا پرستی کے اثبات میں جو کچھ لکھ چکے ہیں،
اس میں سے ہر بات ٹھیک ٹھیک اُس کی نبوت کے ثبوت میں
بھی کہی جاسکتی ہے۔

اب صرف ایک معاملہ کی تشریح باقی رہ گئی ہے، یعنی یا جوج
اور ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ اور جو سد سائرس نے بنائی
تھی اس کی تاریخی نوعیت کیا ہے؟

یاجوج ماجوج

قرآن مجید نے یاجوج اور ماجوج کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہاں ہے، دوسرا سورہ انبیاء میں ہے: "خسّیٰ اِذَا نَحْتُ یَا جُوجَ وَ مَا جُوجَ وَ هُم مِّنْ کُلِّ عَدَبٍ نَّیْسُوْنَ" (۹۶: ۲۱)

یاجوج اور ماجوج کا نام سب سے پہلے عہد عتیق میں آیا ہے۔ حزقیل نبی کی کتاب میں جیفیں بخت نصر اپنے آخری حملہ بیت المقدس میں گرفتار کر کے بابل لے گیا تھا، اور جو سائرس کے ظہور تک زندہ رہے، یہ پیشین گوئی ملتی ہے:

"اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اُس نے کہا: اے آدم زاد! تو جوج کی طرف اپنا منہ کر کے اس کے برخلاف نبوت کر۔ جوج کی طرف، جو ماجوج کی سرزمین کا ہے، اور روس سک اور تو بال کا سر در ہے۔ خداوند یہود و اہ یوں کہتا ہے کہ میں تیرا مخالف ہوں۔ میں تجھے پھرا دوں گا۔ تیرے

جہڑوں میں بنیاں ماروں گا۔ تیرے سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو جنگی پوشاک پہنے چوپھریاں اور سپر لٹے ہوئے ہیں اور سب شمشیر بکف ہیں، کھینچ نکالوں گا۔ اور میں ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط کو بھی کھینچ نکالوں گا جو سپر لٹے ہوئے اور خود پہنے ہوئے۔ نیز جو مر اور شمال بعید کے اطراف کے باشندگان تجرّمہ اور ان کا سارا لشکر۔

اس کے بعد دوڑ تک تفصیلات چلی گئی ہیں۔ اور چار باتیں حقیقت کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جوج شمال کی طرف سے آئے گا، تاکہ لوٹ مار کرے۔ دوسری یہ کہ "ما جوج" پر اور ان پر جو جہڑوں میں سکونت رکھتے ہیں، تباہی آئے گی۔ تیسری یہ کہ جو لوگ اسرائیل کے شہروں میں بسنے والے ہیں، وہ بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے اور ان کے بے شمار ہتھیار ان کے ہاتھ آئیں گے۔ چوتھی یہ کہ ماجوج کی تباہی کا گورستان "مسافروں کی وادی" میں بنے گا جو سمندر کے پورب میں ہے، ان کی لاشیں عرصہ تک وہاں پڑی رہیں گی۔ لوگ انھیں کاڑتے رہیں گے تاکہ رہگذر صاف ہو جائے۔ (باب ۳۸-۳۹)

یہ واضح رہے کہ اس پیشین گوئی سے پہلے سائرس کے ظہور اور یہودیوں کی آزادی و خوش حالی کی پیشین گوئی بیان کی جا چکی ہے۔

اور اس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے جس میں خرقیل بنی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا، اور جسے قرآن نے بھی سورہ بقرہ کی آیت "او کالذی مر علی قریۃ وحی خادۃ علیٰ عروشہا" (۲: ۲۵۹) میں بیان کیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جوج اور ماجوج کا معاملہ بھی اسی زمانہ کے لگ بھگ پیش آنے والا ہو، یعنی سائرس کے زمانہ میں۔ اور یہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا ایک مزید ثبوت ہے۔ کیونکہ مستر آن صاف کہہ رہا ہے کہ اسی نے یا جوج و ماجوج کے حلوں کی روک تھام کے لئے ایک سد تعمیر کی تھی۔

عہد عتیق کے بعد یہ نام ہمیں مکاشفات یوحنا میں بھی ملتا ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا، اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی، یعنی یا جوج و ماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑانے کے لئے جمع کرنے نکلے گا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا۔ وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائے گی۔" (۷: ۱۲)

گاگ اور مے گاگ

یا جوج اور ماجوج کے لئے یورپ کی زبانوں میں Gog اور Magog کے نام مشہور ہو گئے ہیں، اور شارحین تورات

کہتے ہیں کہ یہ نام سب سے پہلے تورات کے ترجمہ سبعینی لہ میں اختیار کئے گئے تھے۔ لیکن کیا اس لئے اختیار کئے گئے تھے کہ جوج اور ماجوج کا یونانی تلفظ یہی ہو سکتا تھا یا خود یونانی میں پہلے سے یہ نام موجود تھے؟ اس بارے میں شارحین کی رائیں مختلف ہیں۔ لیکن زیادہ قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں نام اسی طرح یا اس کے قریب قریب یونانیوں میں بھی مشہور تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقتور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لے کر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف اُمتد تار رہا، جن کے مشرقی حلوں کی روک تھام کے لئے چینوں کو سیکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی، جن کی مختلف شاخیں تاریخ میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں۔ اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگو کے نام سے روشناس ہوا، اور ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے۔ اسی قوم کی ایک شاخ تھی جسے یونانیوں نے سینٹیں (Seythian) کے نام سے

لے ترجمہ سبعینی سے مقصود تورات کا وہ پہلا یونانی ترجمہ ہے جو اسکندریہ میں شاہی حکم سے ہوا تھا اور جس میں ستر علمائے یہود شریک تھے

پکارا ہے، اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لئے سائرس نے سد تعمیر کی تھی۔

منگولیا

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب "منگولیا" کہلاتا ہے۔ لیکن "منگول" لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے لئے جب ہم چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں (اور ہیں اسی طرف رجوع ہونا چاہئے کیونکہ وہ منگولیا کے ہمسایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام "موگ" تھا۔ یقیناً یہی "موگ" ہے جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں "میگ" اور "مے گاگ" پکارا جاتا ہوگا اور یہی عبرانی میں "ماجوج" ہو گیا۔

چین کی تاریخ میں ہیں اس علاقہ کے ایک اور قبیلہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو "یوچی" (Yueh-Chi) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "یوچی" ہے جس نے مختلف قوموں کے عناصر و تلفظ سے گزر کر کوئی ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ عبرانی میں "یاجوج" ہو گیا۔

اس امر کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ان نتائج پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو مختلف قوموں کے نسلی، جغرافیائی اور لغوی علاقوں کی بحث و تنقیب سے پیدا ہوئے ہیں، اور جو موجودہ زمانے میں تاریخ اقوام کے طے شدہ ہادیات ہیں۔

کرہ ارضی کی بلند سطح کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور جسے آج کل منگولیا اور چینی ترکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے تاریخ قدیم کی بے شمار قوموں کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے۔ یہ نسل انسانی کا ایک ایسا سرچشمہ تھا جہاں پانی برابر اُبلتا اور جمع ہوتا رہتا، اور جب بہت بڑھ جاتا تو مشرق و مغرب کی طرف اُمنڈنا چاہتا۔ اس کے مشرق میں چین تھا، مغرب و جنوب میں مغربی اور جنوبی ایشیا، اور شمال مغرب میں یورپ۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے قوموں اور قبیلوں کے سیلاب اُمنڈتے رہے۔ کچھ وسط ایشیا میں آباد ہو گئے۔ کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ کچھ وسط ایشیا سے نیچے اتر گئے اور جنوبی و مغربی ایشیا پر قابض ہو گئے۔ یہ قبائل جو اس علاقہ سے نکلتے تھے، مختلف ملکوں میں بس کر وہاں کی خصوصیات اختیار کر لیتے تھے، اور رفتہ رفتہ ایک مقامی قوم بن جاتے تھے، لیکن ان کا وطن سرچشمہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا۔ یہاں تک کہ پھر قبائل کا ایک نیا سیلاب اُٹھتا اور کسی نئے علاقے میں پہنچ کر نئی مقامی قومیت کی تخلیق کر دیتا۔

یہ علاقہ صدیوں تک اپنی اصلی وحشیانہ حالت پر باقی رہا، لیکن جو قبائل یہاں سے نکل نکل کر مختلف ملکوں میں بستے گئے انہوں نے مقامی خصوصیات اختیار کر کے تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد ان کی حالت اس درجہ مختلف

ہو گئی کہ ان میں اور ان کے قدیم ہم وطنوں میں کوئی بات بھی مشترک باقی نہیں رہی۔ وہ اب مذہب ہو رہے تھے۔ یہ بدستور وحشی تھے۔ وہ تہذیب کے ضامی ہتھیاروں سے لڑتے تھے، یہ وحشت کی قدرتی بحیثیت اور درندگی سے۔ ان میں زراعت، صنعت اور ذہنی ترقی کی مختلف شاخیں ابھر رہی تھیں۔ وہ ان سب سے نا آشنا تھے۔ سرد علاقہ کی صحرائی زندگی اور وحشیانہ خصائل کی خشونت نے انہیں وقت کی ثالثہ اقوام کے لئے ایک خوفناک ہستی بنادیا تھا۔

قبل اس کے کہ تاریخی عہد کی صبح طلوع ہو، شمال مغربی قبائل کی یہ ہاجرت شروع ہو چکی تھی، اور اس کا سلسلہ تاریخی عہد میں بھی بدستور جاری رہا۔

ان ہی قبائل کا ایک ابتدائی گروہ وہ تھا جو آریں نسل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نیچے اتر کر پنجاب میں آباد ہو گیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور فارس اور میڈیا اور انا تولا میں بس گیا۔ اسے اب انڈو آریہین آریہ کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ ہندوستان اور یورپ، دونوں کی آریائی اقوام کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا تھا، اُس نے اپنا نسلی خطاب برابر یاد رکھا اور اپنے کو آریا ورتھ کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا اُس نے اپنی ابتدائی قیام گاہ کو ایریانیہ کے نام سے موسوم کیا (جسے اوستا میں

ایریانیہ ویکو کہا گیا ہے) اور یہی ایریانیہ ایران ہو گیا۔ جو قبائل انا تولا تک پہنچ گئے تھے وہ غالباً ہیتی (Hittite) کے نام سے پکارے گئے جنہیں تورات کی کتاب پیدائش میں "حتی" کہا گیا ہے، اور مصر کے قدیم نوشتوں میں "حتی" پایا جاتا ہے۔

جو قبائل یورپ میں پہنچے، وہ گوتم، فرانک، المان، وٹال، یوٹان اور ہن کے نام سے مشہور ہوئے، اور ان ہی کی ایک وسیع شاخ وہ تھی جو بحر اسود سے لے کر دریائے ڈنیوب کی بالائی وادی تک پھیل گئی اور سیتھین کے نام سے پکاری گئی۔ وسط ایشیا کے مشرقی قبائل بھی جو بکڑیا (بلخ) پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے سیتھین ہی تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور خود دارانے اپنے کتبہ استخر میں انہیں اسی نام سے پکارا ہے۔

ان قبائل کی جو تین شاخیں شمالی ہند، انا تولا (ایشیا کے کوچک) اور ایران میں بس گئی تھیں، انہیں ایسا ماحول ملا جو زراعت کے لئے موزوں تھا۔ اس لئے بہت جلد انہوں نے زراعتی زندگی اختیار کر لی، اور پھر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگیں۔ لیکن جو شاخیں یورپ کی طرف بڑھیں انہیں ایسا ماحول میسر نہیں آیا۔ اس لئے صحرائی زندگی کی تمام خصوصیات ان میں بدستور باقی رہیں اور صدیوں تک متغیر نہ ہوئیں۔ اب گویا ان قبائل کی تین حالتیں ہو گئی تھیں۔

اولاً، منگولیا کے اصلی باشندے جو یک مستلم وحشی اور صحرائی

تھے، اور ان کی یہ حالت بغیر کسی تغیر کے برابر قائم رہی۔
ثانیاً، بحر اسود کے شمالی ساحل اور شمالی یورپ کے قبائل، جو
گوا اپنے مولد اصلی سے الگ ہو گئے تھے، لیکن ان کی وحشیانہ
خصوصیات نہیں بدلی تھیں۔

ثالثاً ہندوستان، ایران اور انا تolia کے قبل جو تدریج
شہریت و حضارت میں ترقی کرنے لگے، اور پھر آگے چل کر ترقی پیم
تہذیبوں کے بانی ہوئے۔

یاجوج ماجوج کا اطلاق

تقریباً ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی مسیحی تک یاجوج
اور ماجوج یا گولگ اور مے گگ کا اطلاق پہلی دو قوموں پر ہوتا رہا۔
پہلی پر اس لئے کہ قومیت اور مقام کے لحاظ سے وہی یاجوج و ماجوج
تھی۔ دوسری پر اس لئے کہ گوا اپنے مولد و مقام سے الگ ہو چکی
تھی لیکن اپنی وحشیانہ خصوصیات میں بالکل تغیر نہیں ہوئی تھی۔
تیسری قسم چونکہ ایک قلم منقلب ہو چکی تھی، اس لئے اب وہ یاجوج و
ماجوج نہیں رہی تھی، بلکہ خود یاجوج و ماجوج کی غارت گریوں کا نشانہ
بن گئی تھی۔ البتہ جب پانچویں صدی مسیحی میں یورپ کے قبائل
کی حالت بھی منقلب ہونا شروع ہو گئی اور مسیحیت اختیار کر کے
تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگے تو قوموں کے حافظہ سے

ان کا نام بھی اتر گیا، اور یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف اسی خطہ میں
سمٹ آیا، جہاں سے پہلے نا شروع ہوا تھا۔ یعنی صرف منگولیا کے
صحرا نور و قبائل ہی یاجوج و ماجوج سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ قرآن
نے سورہ انبیاء میں ان کے جس خروج کی خبر دی ہے وہ منگولیا کے
تاتاریوں کا آخری خروج تھا۔

یورپ کی تمام موجودہ قومیں (لاطینی نسل مستثنیٰ کر دینے کے بعد)
براہ راست ان ہی قبائل کی نسل سے ہیں۔ جیسا کہ معلوم و مسلم ہے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نسل انسانی نے اکثر
حالتوں میں پہلے صحرا نور دی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے۔

پھر توطن اور اقامت گزینی اختیار کی ہے اور اس اختلاف حالت نے
ہمیشہ دو طرح کے انسانی گروہوں سے دنیا کو آباد رکھا ہے۔ صحرا نور
قبائل کے گروہ اور اقامت گزینی قبائل کے گروہ۔ معیشت کی یہ

دونوں حالتیں اس درجہ مختلف تھیں کہ ایک ہی نسل کے دو
قبیلوں میں سے ایک قبیلہ اگر صحرا نور رہتا تھا اور دوسرا

اقامت گزین ہو جاتا تھا، تو چند صدیوں کے بعد نہ صرف ایک
دوسرے سے جہنی ہو جاتے تھے بلکہ بالکل متضاد قسم کی مخلوق بن جاتے
تھے۔ صحرا نور و قبائل کو غذا کے لئے جانوروں کے دودھ اور شکار
کے گوشت پر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ اقامت گزین قبائل کو اناج پر۔
وہ گھوڑوں کی برہنہ پیٹھ پر زندگی بسر کرتے۔ یہ کھیتوں میں اور

مکانوں کی چار دیواری میں۔ ان کی زندگی کا ماحول صحرائیت تھی، ان کا ماحول شہیتہ۔ ان کو نشوونما کے لئے جنگ کی ضرورت تھی ان کو امن کی۔ ان کا جسم روز بروز طاقتور اور محنت پسند ہوتا جاتا تھا، ان کا روز بروز کمزور اور راحت پسند۔ وہ روز بروز وحشت و خونخواری میں بڑھتے جاتے تھے، یہ روز بروز تہذیب و حضارت میں، تہذیب و حضارت کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات و خصائل میں لطافت اور نرمی پیدا ہو صحرائیت و خانہ بدوشی کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات تند اور خصائل میں وحشت و خشونت ہو نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں اقامت گزین قبائل شائستہ ہوتے جاتے، صحراؤں اور قبائل کی ہستی ان کے لئے ہولناک اور ناقابل مزاحمت ہوتی جاتی۔ جب کبھی دونوں میں مقابلہ ہوتا تو شہری قبائل دیکھتے کہ صحراؤں اور قبائل عورتوں کی طرح خوفناک اور درندوں کی طرح خونخوار ہیں۔ اور صحراؤں اور قبائل معلوم کر لیتے کہ ان کی غارت گریوں کے لئے شہری آبادیوں سے زیادہ کوئی سہل شکار نہیں۔

البتہ صحراؤں اور قبائل متفرق تھے، اور اقامت گزینی کے طریقوں سے نا آشنا۔ اقامت گزین قبائل باہم مربوط تھے اور معیشت کے منظم طریقوں سے آشنا، اس لئے قدرتی طور پر صحراؤں اور درندوں کے حملے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ خوفناک درندوں کی طرح آبادیوں پر گرتے اور قتل و غارت کر کے بک جاتے۔ لیکن جم کر ٹک نہیں سکتے تھے، اور نہ علاقے بچ کر کے اپنے قبضے

میں رکھ سکتے تھے۔ مگر جب کبھی صدیوں کے بعد ان میں کوئی حکمران قائم پیدا ہو جاتا، اور وہ بہت سے قبیلوں کو متحد کر کے ایک فوج کی نوعیت دے دیتا تو پھر قتل و غارتگری کی ایک ایسی منظم طاقت پیدا ہو جاتی جو صرف وقتی حملوں ہی پر قانع نہیں رہتی بلکہ ملکوتوں اور قوموں پر قابض ہو جاتی اور شہری آبادیوں کی بڑی سے بڑی قوتیں بھی اس کی راہ نہیں روک سکتیں!

تاریخ شاہد ہے کہ صحراؤں اور غیر متہمدن اقوام کے مقابلہ میں شہری اور متہمدن اقوام کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا۔ یہاں تک کہ علم و صنعت نے ایسے ہتھیار اور جنگی وسائل پیدا کر دیئے جن کے مقابلہ سے غیر متہمدن اقوام عاجز آ گئیں۔

چنانچہ ان شمالی مشرقی قبائل کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا افسانہ ہے۔ ان کی جن شاخوں نے اقامت گزینی کی زندگی اختیار کر لی تھی، وہ بالکل ایک دوسری قوم بن گئیں، اور جنہیں ایسے حالات میسر نہیں آئے، وہ بدستور صحراؤں اور درندہ بن گئے۔ اقامت گزین قبائل کے لئے صحرا اور درندہ قبائل صرف اجنبی ہی نہیں ہو گئے تھے، بلکہ خوفناک بھی ہو گئے تھے، کیونکہ ان کی روز افزوں شہریت ان کی صحرائی وحشت ناکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ جب کبھی موقع پاتے، قرب و جوار کی آبادیاں غارت کرتے، اور اگر قبائل کا کوئی قائد بکل آتا تو ان کی غارت گریاں دور دور تک بھی پہنچ جاتیں۔

صدیوں تک ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ پھر جب چوتھی صدی مسیحی سے ان کے اندر ایسے قائد پیدا ہوئے جنہوں نے نظم و اطاعت کا راز پالیا تھا، تو اچانک ان کی طاقت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی میں اٹیلا (Attila) نے جوہن قبیلہ کا قائد تھا، ایک عظیم فاتح کی حیثیت اختیار کر لی اور رومن امپائر کی دونوں مشرقی و مغربی ملکوں کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ پھر یہی قبائل ہیں جو بالآخر اس طرح تمام یورپ پر چھا گئے کہ نہ صرف رومن امپائر کو بلکہ رومی تمدن کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دیا۔

چند صدیوں کے بعد تاریخ یہ منظر پھر دہراتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود منگولیا میں ایک نیانگلی قائد جنگیز خاں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ تمام تاتاری قبائل کو اپنے ماتحت ایک قوم بنا دیتا ہے، اور پھر فتح و تسخیر کا ایک ایسا ہولناک سیلاب اُمتداتا ہے جسے اسلامی ممالک کی کوئی تمدن قوت بھی نہ روک سکی۔ وسط ایشیا سے لے کر عراق تک جو ملک اس کے سامنے آیا، خس و خاشاک کی طرح پہ گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یا جورج ماجورج سے مقصود یہی منگولین قوم اور اس کی تمام صحرائورداور وحشی شاخیں ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں، ان کے خروج و ظہور کے مختلف دور تاریخی ترتیب سے منضبط کر لیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سائرس کے زمانے میں یہ قوم کہاں تھی، اور کیوں اسے سد تعمیر کرنے کی ضرورت

پیش آئی؟

اس بارے میں تاریخ کی شہادتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) پہلا دور تاریخی عہد سے پہلے کا ہے۔ جب شمال مشرق سے ان قبائل کے ابتدائی گروہ نکلے اور وسط ایشیا میں آباد ہو گئے۔ پھر جنوب اور مغرب میں پھیلنے لگے۔ اس خروج و انشعاب کی رفتار بہت سست رہی ہوگی اور بے شمار نسلیں پیش آئی ہوں گی۔

(۲) دوسرا دور صبح تاریخ کا ہے، لیکن روشنی ابھی دھندلی چھاپا تھا۔ گزینی اور صحرائوردی کی دو مختلف اور متوازی معیشتوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند، ایران اور اناٹولیا کے قبائل اقامت گزینی کی زندگی میں بدل چکے ہیں۔ مگر وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود تک صحرائورد قبائل کے جتنے پھیلتے جاتے ہیں، اور مشرق سے نئے نئے قبیلوں کے اقدام کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ زمانہ تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵۰۰ قبل مسیح تک کا تصور کرنا چاہئے۔ لہ

لہ یہ سن تعین اس طرح کے تمام تعینات کی طرح محض تاریخی قیاسات پر مبنی ہے، اور اسی لئے اس بارے میں نظائر تاریخ کی رائیں مختلف ہوئیں۔ البتہ حال کے انکشافات سے ایک بات تقریباً پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ یعنی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح اناٹولیا میں "حتی" یا حتی "تمدن شروع ہو چکا تھا اور قدیم مصری (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

(۳) تیسرا دور تاریخ کی روشنی میں پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اب بحر خزر اور بحر اسود کا علاقہ ایک وحشی اور خونخوار قوم کا مرکز بن چکا ہے، اور وہ مختلف ناموں میں اور مختلف جہتوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ پھر اچانک تاریخ کے افق پر "سیتھین" قوم کا نام ابھرتا ہے۔ یہ وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود کے شمالی کناروں تک آباد ہے، اور اطراف و جوانب میں برابر حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ یہ زمانہ آشوری تمدن کے ظہور اور بابل اور نینوا کے عروج کا تھا، اور ہیروڈوٹس کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آشوریوں کی شمالی سرحد پر سیتھین قبائل کی غارت گریاں برابر جاری رہیں۔ یہ شمالی سرحد بحر خزر کے جنوبی ساحل اور ارمینیا کے سلسلہ کوہ تک پہنچی ہوئی تھی، اور وہ کاکیشیا کے درے سے اتر کر آشوری آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ پھر ۶۳۰ قبل مسیح میں اچانک ان کا ایک عظیم گروہ اسی راہ سے اترتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تمدن کا معاشرہ تھا۔ "بوفاز کوئی" میں جو حقیقی کتب خانہ برآمد ہوا ہے اور جس میں بیس ہزار کے قریب منقوش تختیاں بکلی ہیں۔ اس نے انیسویں صدی کے تاریخی تخمینے بہت کچھ بدل دیئے ہیں، اور اب یہ رجحان کہ اس زمانے کی مدت گھٹائی جائے تقریباً منقود ہو رہا ہے۔

اور ایران کا تمام مغربی حصہ پامال کر دیتا ہے۔ یونانی مؤرخ کہتے ہیں کہ آشوری مملکت کی تباہی کا ایک بڑا باعث یہی غارتگری تھی کہ (۴) چوتھا دور ۵۵۰ قبل مسیح کا قرار دینا چاہئے، جب سائرس کا ظہور ہوا اور فارس اور میڈیا کی متحدہ شہنشاہی کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور صدیوں تک ان کے حملوں کی کوئی صدا تاریخ کی سماعت تک نہیں پہنچتی۔ اس عہد میں صرف دو موقعوں پر ان کا ذکر آتا ہے۔ پہلا سائرس کے زمانے میں، جب وہ فتح بابل سے پہلے سیتھین قبائل کے سرحدی حملوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ دوسرا دارا کے زمانے میں جب وہ باغورس عبور کر کے دریائے ڈیوب کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے اور ان قبائل کو دوڑ تک بھگا دیتا ہے۔

دارا کے حملہ کے بعد ان کا دباؤ شمالی یورپ کی طرف بڑھنے لگا۔ (۵) پانچواں دور تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں منگولین قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا ہے اور پہلے چین کی آبادیوں پر ٹوٹتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وسط ایشیا کی قدیم شاہراہ اختیار کرتا ہے۔ چین کی تاریخ میں انھیں ہیونگ نہ (Hiung-nu) کے نام سے پکارا گیا ہے، اور یہی نام آگے چل کر ہن ہو گیا ہے۔

یہی زمانہ ہے جب شہنشاہ چین شین ہوانگ ٹی نے ان حملوں کے روکنے کے لئے وہ عظیم الشان دیوار تعمیر کی جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے اور پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے۔ اس کی تعمیر ۲۱۴ قبل مسیح میں شروع ہوئی، اور بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس میں ختم ہوئی۔ اس نے شمال اور مغرب کی طرف سے منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں سدود کر دی تھیں۔ اس لئے ان کا رخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا۔

(۶) چھٹا دور تیسری صدی مسیح کا ہے۔ جب ان قبائل نے یورپ میں ایک نئی کرپٹ لی اور بالآخر رومی مملکت اور رومی تمدن کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

(۷) ساتواں اور آخری دور بارہویں صدی مسیح اور چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ جب منگولیا میں تازہ دم قبائل کی ایک بڑی تعداد پھرتیار ہو گئی، اور چینگیز خاں نے انھیں متحد کر کے ایک نئی فتح مندر طاقت پیدا کر دی۔

مندرجہ مندر خلاصہ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیستھین قبائل کے حملوں سے غارت ہو رہا تھا، اور جس ہاتھ نے اچانک ظاہر ہو کر ان کے حملے روک دیئے اور پھر ہمیشہ کے لئے مغربی ایشیا ایک مسلم محفوظ ہو گیا، وہ سائرس کا ہاتھ تھا۔ پس یقیناً منگولین نسل کے

یہی سیستھین قبائل تھے جو یا جورج و ما جورج کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور ذوالقرنین یعنی سائرس نے ان ہی کی راہ روکنے کے لئے سد تعمیر کی جس طرح تین صدیوں کے بعد چینی مجبور ہوئے کہ انھیں روکنے کے لئے ایک دیوار تعمیر کریں۔

اب غور کرو سیستھین قبائل کے یہ حملے کس جانب سے ہوتے تھے؟ ہیروڈوٹس وغیرہ یونانی مورخ بتلاتے ہیں کہ صرف ایک راہ سے یعنی کاکیشیا کے درہ سے۔ یہی مقام صدیوں تک دونوں علاقوں میں درمیان کا پھانگ رہا ہے۔

اب اگر سائرس ان حملوں سے محفوظ ہونا چاہتا تھا تو کیا اس کے لئے ضروری نہ تھا کہ یہ پھانگ بند کر دے؟ قدرتی طور پر ضروری تھا، اور اس لئے اس نے سد تعمیر کر کے یہ راہ سدود کر دی۔ چونکہ ان حملوں کی صرف یہی ایک راہ تھی اور وہ اس طرح بند کر دی گئی، اس لئے یا جورجی حملوں کا بھی یک قلم خاتمہ ہو گیا۔

اب پھر حقیقتیں بنی کی پیشین گوئی پر ایک نظر ڈالو۔ اس میں جورج کو روش، مسک اور تو بال کا سردار کہا ہے، اور یہ ٹھیک ٹھیک ان ہی قبائل کے نام ہیں۔ "روش" وہی ہے جس سے "رشیا" نکلا۔ "مسک" وہی ہے جو "موسکو" ہوا۔ اور تو بال "بحر اسود" کا بالائی علاقہ تھا۔

پھر کہا ہے کہ میں تجھے پھر ادوں گا "اور" تیرے جڑوں میں نمایاں

یہ وہی واقعہ ہے کہ سائرس نے سیتھین قبائل کے منہ پھرا دیئے اور سد تعمیر کر کے اُن پر اُن کی راہ روک دی۔ پھر کہا ہے۔ ایسا معاملہ واقع ہو گا کہ اُن کے تمام ہتھیار جلا دیئے جائیں گے اور رہزناؤں کی ایک وادی میں جو سمندر کے پورب میں ہے ان قوموں کا گورستان بنے گا، نیز عرصہ تک لوگ لاشیں کاڑتے رہیں گے تاکہ راہ صاف کر دیں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو داراکے حملہ یورپ میں پیش آیا۔ دارا کی فوج مملکت کی تمام اقوام سے مرکب تھی۔ اس میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ باسفورس عبور کر کے مشرقی یورپ پہنچ گیا تھا، اور اگرچہ یونانیوں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا، لیکن اس لشکر کشی میں بے شمار سیتھین مارے گئے اور اُن کی قوت عرصہ تک کے لئے مضمحل ہو گئی۔

باقی رہی وہ پیشین گوئی جو مکاشفات یوحنا میں ملتی ہے، تو مکاشفات کے اکثر مقامات کی طرح اس مقام کی بھی کوئی حتمی ہوئی تفسیر تارحین انجیل نہ کر سکے۔ اس میں ایک ہزار برس کی مدت بتلائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت سے مقصود کون سی مدت ہے اور کب سے شروع ہونی ہے؟ اگر حضرت مسیح سے شروع ہوتی ہو، تو ظاہر ہے کہ دسویں صدی مسیح میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا ہو سکتا ہے کہ ہزار برس سے مقصود

وہ مدت ہو، جو سقوط بابل سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اس معاملہ سے پہلے بابل کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو پھر ایک بات بن سکتی ہے۔ بابل کا سقوط چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے اور چوتھی صدی مسیح میں یورپ کے منگولین قبائل نے رومی مملکت پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ پس ماجوج و ماجوج کا یہ خروج سقوط بابل کے ہزار برس بعد ضرور ہوا ہے۔

”ماجوج“ کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بھی آیا ہے، جہاں حضرت نوح کے تین لڑکوں سام۔ حام اور یافت سے اقوام عالم کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یافت کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے:

”جم، ماجوج، مادی، یونان، توبال، مسک اور تیراس

پیدا ہوئے“ (۲:۱۰)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج سے مقصود منگولین نسل ہے۔ کیونکہ قدیم مورخوں نے اسی تصریح کی بنا پر انھیں یافتی نسل قرار دیا ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب پیدائش کا مواد قید بابل کے زمانہ میں تیار ہوا ہے، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ماجوج اور مادیوں کو ہم نسل سمجھا جاتا تھا۔

یہ یاد رہے کہ اگرچہ دینا عرصہ تک کتاب پیدائش کے اس بیان پر مطمئن رہی، اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ تمام توہین حضرت

نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔
لیکن اب اس کی علی قدر قیمت یک قلم مشتبہ ہو گئی
ہے، اور اسے کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر
سے ایک تاریخی بیان کو دیکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ
ایک ایسا نوشتہ ہے جس میں ۵۰۰ سال قبل مسیح
کے یہودی تصورات نظر آ جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایک
عنصر ان مقدس روایتوں کا بھی ہے جو قومی حافظہ نے محفوظ
رکھی تھیں، لیکن ساتھ ہی بابل اور آشوری روایتوں کا
بھی ایک عنصر شامل ہو گیا ہے جو قیام بابل کی طویل مدت کا
قدرتی نتیجہ تھا۔

سد یا جوج

اب ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ سائرس نے جو سد
تعمیر کی تھی اس کا صحیح محل کیا تھا، اور موجودہ زمانہ کے نقشہ
میں اسے کہاں ڈھونڈنا چاہئے؟
بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر در بند آباد
ہے، یہ شہر اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلہ
کوہ خستم ہوتا ہے اور بحر خزر سے مل جاتا ہے۔ اس مقام

پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے، جو
سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی
ہے، اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی
حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے
ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بلند کر دیا تھا، دوسری
طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلان پہنے
کی وجہ سے قابل عبور ہو سکتا تھا۔

ساحل کی طرف یہ دیوار دھری ہے۔ یعنی اگر آذربائیجان
سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں، تو پہلے ایک دیوار ملتی
ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے۔ اس میں
پہلے ایک دروازہ تھا۔ دروازہ سے جب گزرتے تھے تو
شہر در بند ملتا تھا۔ اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ در بند
سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے۔ لیکن یہ دھری
دیوار صرف دو میل تک گئی ہے۔ اس کے بعد اکھری دیوار کا
سلسلہ ہے۔

دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں، وہاں ایک قلعہ ہے۔
قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں
رہتا لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے، اور اسی پانچ سو گز
کے عرض میں در بند آباد ہے۔ اس دھری دیوار کو ایرانی قدیم سے

”دوبارہ لکھتے آئے ہیں یعنی دہرا سلسلہ۔

یہ قطعی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے، ساسانی عہد میں یہ مقام موجود تھا، اور اسے ”در بند“ کہا جاتا تھا، یعنی بند دروازہ۔ کیونکہ مقدسی، ہمدانی، مسعودی، اصطخری، یاقوت اور قزوینی وغیرہ تمام مسلمان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اسی نام سے اس کا ذکر کیا ہے، اور سب لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں یہ مقام شمالی سرحد کا سب سے زیادہ اہم مقام تھا کیونکہ اسی راہ سے شمال کے حملہ آور ایران کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ یہ ایرانی مملکت کی کبھی تھی۔ جس کے ہاتھ یہ کبھی آجاتی، وہ پوری مملکت کا مالک ہو جاتا۔ اسی لئے ضروری ہوا کہ اُس کی حفاظت کا اس درجہ اہتمام کیا جائے۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں جب یہ علاقہ فتح کیا، تو ساسانیوں کی طرح انھوں نے بھی اس مقام کی اہمیت محسوس کی۔ وہ اسے ”باب الابواب“ لے اور ”اباب“ کے نام سے پکارنے

لے عرب جغرافیہ نویس در بند ہی کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن چونکہ عام نام باب الابواب پڑ گیا تھا، اس لئے عنوان کے لئے اکثروں نے باب الابواب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں اس مقام کا حال ”باب الابواب“ (باقی دیکھئے صفحہ ۱۳۳)

لگے۔ کیونکہ مملکت کے لئے یہی مقام شمالی دروازہ تھا، اور یہ بہت سے دروازوں میں سے آخری دروازہ تھا جو اس دیوار کے طول میں بنائے گئے تھے۔ بعضوں نے اسے ”باب ترکہ“ اور ”باب الخزر“ کے نام سے بھی پکارا ہے، کیونکہ تاتاریوں اور تاتاری النسل کاکیشین قبیلوں کی آمد و رفت کی راہ یہی تھی۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف، کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں، تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درہ دارپال (Darial Pass) کے نام سے مشہور ہے، اور موجودہ زمانے کے نقشے میں اس کا محل ولاڈی کیوکاز (Vladi Kaukaz) اور ٹفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں ہو کر گزرا ہے اور دور تک دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے، اور ارمنی روایتوں میں اسے ”آہنی دروازہ“ کے نام سے پکارا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کس نے تعمیر کی تھی؟

دقیقہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے، ہی کے نام سے لکھا ہے۔ پس حرف ”با“ میں دیکھنا چاہئے نہ کہ ”ڈال“ میں۔

لے یونانی کاکیشیا، روسی کیوکاز اور فارسی تفتاز ایک ہی لفظ ہے۔

تمام عرب مورخوں کا بیان ہے کہ نوشیرواں نے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ سعودی نے اس کی تعمیر کی بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور بعد کے تمام مصنف اسے نقل کرتے آئے ہیں۔ لیکن جب ہم قبل از اسلام عہد کے تاریخی نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے یہاں ایک دیوار موجود تھی اور اس نے شمال سے جنوب کا راستہ روک رکھا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے پہلی صدی مسیحی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس اس کا ذکر کرتا ہے۔ پھر پروکوپیس (Procopius) چھٹی صدی مسیحی کے اوائل میں خود اپنا عینی مشاہدہ نقل کرتا ہے۔ کیونکہ ۵۲۸ء مسیحی میں جب رومن جنرل بلی ساریوس (Belisarius) نے اس علاقہ پر حملہ کیا ہے تو یہ اس کے ہمراہ تھا۔ نوشیرواں کا زمانہ ۵۳۱ء مسیحی سے ۵۴۹ء مسیحی تک تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ استحکامات اس کے بنائے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

سکندر کا انتساب

اب یہاں ایک اور الجھاؤ پڑتا ہے۔ جوزیفس اور پروکوپیس دونوں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ان استحکامات کا بانی سکندر تھا۔ حالانکہ سکندر کی فتوحات کا کوئی واقعہ تاریخ کی نظر

سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس علاقہ میں آیا ہو یا یہاں کوئی جنگ کی ہو۔ زمانہ حال کے ایک امریکن مورخ سٹراے۔ وی ولیمس جیکسن (پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی) نے اس علاقہ کی سیاحت کی ہے اور اس کے تفصیلی حالات اپنے سفرنامہ میں بیان کئے ہیں۔ وہ اس شکل کا یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ سکندر کے کسی جنرل نے یہ استحکامات تعمیر کئے ہوں گے۔ کم از کم درہ داریال کے استحکامات۔ بعد کو ساسانی فرمانرواؤں نے انھیں اور زیادہ وسیع اور مکمل کر دیا۔ چونکہ ابتدائی تعمیر سکندر کے عہد کی تھی، اس لئے سکندر کی طرف منسوب ہو گئی۔ ۱۵

۱۵ دیکھو پروفیسر مومف کی کتاب "From Constanti nopal to the Home of Omar Khyam" صفحہ ۶۲۔ ہم ان کی ایک دوسری تصنیف کا زردشت کے حالات میں حوالہ دے چکے ہیں۔

۱۵ بہت ممکن ہے کہ سکندر کی نسبت یہ خیال اس بنا پر پیدا ہو گیا ہو کہ بعد کے بعض مورخوں نے غلطی سے اس سلسلہ کوہ کو کاکیس لکھ دیا ہے جو بحر خزر کے مشرق جانب واقع ہے اور جسے سکندر نے وسط ایشیا سے ہندوستان جاتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسٹرابون نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیئے ہیں، اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا، تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں؟

اس طرح کے غیر معمولی استحکامات جمعی تعمیر کئے جاسکتے ہیں جب کہ امن و حفاظت کی ضرورت نے انھیں ناگزیر کر دیا ہو۔ لیکن سکندر کو اپنی تمام فتوحات میں اس طرح کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ اس کے زمانے میں یہ علاقہ ایران کی قدیم شہنشاہی کے ماتحت تھا۔ اُس نے شام کی راہ سے ایران پر حملہ کیا، اور پھر وسط ایشیا ہوتا ہوا ہندوستان پہلا گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر ابھی بابل ہی میں تھا کہ انتقال کر گیا۔

ایسی حالت میں وہ کون سے حالات ہو سکتے ہیں جو کاکیشیا کے استحکامات پر اسے مجبور کر سکتے تھے؟ اور اگر پیش آئے تو کب؟

اصل یہ ہے کہ یہ استحکامات سکندر سے دو سو برس پہلے سائرس نے تعمیر کئے تھے، اور درہ داریال کی سد، وہی سد ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

حسب ذیل وجوہ و قرائن سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اولاً، سائرس اور سکندر کی دو باتیں تاریخ کی قطعی روشنی میں آچکی ہیں۔ سائرس کے زمانے میں یہاں سے سیتھین قوم کے حملے ہو رہے تھے۔ سکندر کے زمانے میں کوئی حملہ آور نہیں تھا۔ سائرس کے لئے ضروری تھا کہ یہ راہ روکے۔ سکندر کو کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سائرس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے کہ فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کی۔ سکندر کی نسبت کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ ان دو باتوں کے جمع کرنے سے جو تاریخی تفسیر پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ سد سائرس نے تعمیر کی ہوگی۔ نہ کہ سکندر کے حکم سے اس کے کسی افسر نے۔

ثانیاً، پروکوپس کے علاوہ دوسرے قدیم مورخوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً لشی ٹس (Tacitus) اور لیڈس (Lyds) نے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ رومی اسے "کاسپین پورٹا" کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنی "باب کاسپین" لیکن اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے کہ یہ سکندر کے عہد کی تعمیر ہے۔

ثالثاً، ایک مثبت شہادت بھی موجود ہے جو سائرس

کی طرف ذہن منتقل کر دیتی ہے۔ یہ ارمنی نوشتوں کی شہادت ہے۔ جسے قرب محل کی وجہ سے مقامی شہادت تصور کرنا چاہئے۔

ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "پھاگ کورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے۔ دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ "کور کا درہ" لے۔ سوال یہ ہے کہ "کور" سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ "گورش" کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے۔ جو سائرس کا اصلی نام تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبہ استخر میں پڑھا جا چکا ہے؟

پروفیسر جیکسن اس ارمنی نام کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ "کور" کا تلفظ "سور" کرتے ہیں، اور پھر عربی کے ایک نام "سول" کا اسے ماحضہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لفظ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

لے در بند نامہ - ص ۲۱ - در بند کی تاریخ میں یہ ایک نہایت جامع کتاب ہے جو ۱۸۴۶ء میں ایک ترک مصنف کاظم بک نے لکھی ہے۔ یہ سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں ترکی و فارسی کا پروفیسر تھا، اور خود در بند کا بادشاہ تھا۔ ۱۸۵۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہسٹری آف در بند کے نام سے شائع ہوا۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے۔ ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی، وہ درہ دار یال کی سد ہے، یا در بند کی دیوار؟ یادوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اُس نے درمیان کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا، اُس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا۔ تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی در بند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں۔ یہ تپھر کی بڑی بڑی میلوں کی دیوار ہے، اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے۔ اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درہ دار یال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے، اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس نے درمیان کی راہ بالکل سدود کر دی ہے۔ چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے۔ اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامر کپڑ" مشہور ہو گیا۔

(لے حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

بہر حال ذوالقرنین کی اصلی سد ہی سد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد غوداس نے یا اس کے جانشینوں نے یہ دیکھ کر کہ کاکیشیا کا مشرقی ڈھلوان بھی خطرے سے خالی نہیں، در بند کی دیوار تعمیر کر دی ہو، اور نوشیرواں نے اسے اور مضبوط کیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ فی الحقیقت نوشیرواں ہی کی تعمیر ہو۔

دیوار در بند کی موجودہ حالت

در بند کی دہری دیوار ۶۱۷۹۶ تک موجود تھی، جس کی تصویر ایک روسی سیاح کی بنائی ہوئی ایچ والڈ (Eichwald) نے اپنی کتاب "کوکاکیس" میں نقل کی ہے، لیکن ۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معائنہ کیا، تو گو آثار باقی تھے، لیکن دیوار گر چکی تھی۔ البتہ اکہری دیوار اکثر حصوں میں اب تک باقی ہے۔

موجودہ زمانہ کے شارحین تورات میں بھی ایک جماعت

دلہ ماشیہ صغیر گزشتہ ترجمہ در بند نامہ از کاظم بک صفحہ ۲۱۔ پروفیسر جیکسن نے بھی اس نام کا ذکر کیا ہے، اور اسے قدیم ایام کے نام سے تعبیر کیا ہے (فردم کرٹسنٹی نوبل ٹوبوم آف عمر خیام صفحہ ۶۱)

اسی طرف گئی ہے کہ یا جورج و ما جورج سے سیتھین قوم مراد تھی۔ لیکن وہ حرفیہ کی پیشین گوئی کا محمل ان کا وہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہیروڈوٹس کے قول کے مطابق ۶۳۰ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ حرفیہ کی کتاب بابل کی اسیری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی بخت نصر کے اسیروں میں سے تھے، اور سیتھین حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس باب میں مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا اور جیویش انسائیکلو پیڈیا میں لفظ Gog کا مقالہ دیکھنا چاہئے۔

ہم نے ذوالقرنین کے بحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ کیونکہ زمانہ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔ یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی جو پیغمبر اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی اور نقل کر دی۔

اس لئے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کر دیا جائے کہ تسک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔

سب سے پہلے ۱۸۴۵ء میں جیمز موریر (James Morier) نے اس کی موجودگی سے علمی دنیا کو روشناس کیا۔ پھر چند سال بعد سر رابرٹ کیر پورٹر (Robert Kerr Porter) نے اس مقام کی علمی پیمائش و تحقیق کر کے مفصل معلومات ہم پہنچائی، اور اپنے سفرنامہ جارجیا و ایران میں مجسمہ کی وہ نقل بھی شائع کر دی جو اس نے پنسل سے تیار کی تھی۔ اس وقت تک قدیم پہلوی زبان اور سنجی خطوط کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مجسمہ سائرس ہی کا ہے۔ بعد کی تحقیقات نے مزید تصدیق کر دی۔ پھر ۱۸۸۴ء میں ڈی لافو (Dieulafoy) نے اپنی مشہور کتاب *Lart antique enperse* میں اس کا اصلی عکس شائع کر دیا، اور اس طرح مجسمہ کی اصل نوعیت دنیا کے سامنے آ گئی۔

اس وقت سے لے کر یہ مجسمہ تاریخ قدیم کے مباحث کا ایک عام موضوع رہا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی یورپین مستشرق کا ذہن اس طرف متقل نہیں ہوا کہ اس کی نوعیت میں مستر آن کٹے ذوالقرنین کی صریح اور قطعی تصدیق نمایاں ہو گئی ہو۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغافل مذہبی تعصب کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان میں کافی تعداد ایسے اہل علم کی ہے جو یقیناً ان تعصبات

استدراک

(۱) ہم نے سائرس کے جس مجسمہ کا اوپر ذکر کیا ہے، اور جس سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ "ذوالقرنین" اسی کا لقب تھا، وہ قدیم سنگ تراشی کی مناہیوں کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔ اور موجودہ عہد کے تمام اہل نظر کا فیصلہ ہے کہ یونانی سنگ تراشی کے نمونوں کی صف میں اگر کوئی ایشیائی نمونہ رکھا جاسکتا ہے تو وہ ہی سائرس کا مرمری مجسمہ ہے۔ یہ ایران کے قدیم دار الحکومت استخر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دارا نے شاہی محل تعمیر کیا تھا۔ اب اس کا بقیہ صرف چند مرمری ستون رہ گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مرتبہ ستون پر یہ مجسمہ بھارا گیا تھا۔

کی آلودگیوں سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں، یہ تغافل علم و نظر کے عجائب مستثنیات میں سے ہے۔

(۳) اس مجسمہ میں سائرس کے سر پر دو سینگوں بکھے ہوئے ہیں اور اطراف میں عقاب کے سے پر — سینگوں کا مطلب واضح ہو چکا۔ لیکن عقاب کے سے پر کیوں بنائے گئے؟ اس کا جواب بھی ہیں یسعیاہ بنی کے صحیفہ سے مل جاتا ہے۔ اس میں جہاں سائرس کے ظہور کی خبر دی گئی ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ :

”دیکھو! میں ایک عقاب کو پورب سے بلاتا ہوں۔ اس

شخص کو جو ایک دور کے ملک سے آکر میری ساری مرضی

پوری کرے گا۔“ (باب ۴۶ : ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دو سینگوں کا معاملہ دانیال بنی کے مکاشفہ سے تعلق رکھتا ہے، اسی طرح عقاب کی تشبیہ یسعیاہ بنی کی پیشین گوئی میں آچک ہے۔ خواہ یہ پیشین گوئیاں بعد کو بنائی گئی ہوں، خواہ فی الحقیقت پیشتر کی ہوں۔ لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ سائرس کے لئے دو سینگوں کا اور عقاب کا تخیل پیدا ہو چکا تھا، اور ٹھیک ٹھیک یہی تخیل ہے جو اس مجسمہ میں قمشکل ہو گیا ہے۔

